Rs. 15/-

ملت کا ترجمان

ماہنامہ

جام نور

دہلی

January 2011

قدامت پرستی اور
تجدد پسندی سے نجات کے لیے
اسلام کی معتدل تعبیر کی ضرورت!

فضل حق، فضل رسول اور آزردہ
تیرہویں صدی کی تین عبقری شخصیات کے روابط محبت والفت

کیا عالم ہونے کے لیے
مدارس کی سند فراغت ضروری ہے؟

9/11 کے بعد دنیا کا سب بڑا ڈرامہ
وکی لیکس کی کہانی مسلم امہ کے خلاف
ایک سازش تھی جسے مسلم بصیرت نے ناکام بنادیا

۹۸ / رواں جام

نواں دور

جنوری ۲۰۱۱ء

محرم الحرام / صفر المظفر ۱۴۳۲ھ

بانگ درا

سند کوئی چیز نہیں، بہتیرے سند یافتہ محض بے بہرہ ہوتے ہیں اور جنھوں نے سند نہ لی اُن کی شاگردی کی لیاقت بھی ان سند یافتوں میں نہیں ہوتی، علم ہونا چاہیے اور علم الفتوی پڑھنے سے نہیں آتا جب تک مدتہا کسی طبیب حاذق کا مطب نہ کیا ہو۔ مفتیان کامل کے بعض صحبت یافتہ کہ ظاہری درس و تدریس میں پورے نہ تھے مگر خدمت علماء کرام میں اکثر حاضر رہتے اور تحقیق مسائل کا شغل ان کا وظیفہ تھا، فقیر نے دیکھا ہے کہ وہ مسائل میں آج کل کے صدہا فارغ التحصیلوں بلکہ مدرسوں بلکہ نام کے مفتیوں سے بدرجہا زائد تھے، پس اگر شخص مذکور فی السوال خواہ بذات خود خواہ بفیض صحبت علماء کاملین علم کافی رکھتا ہے، جو بیان کرتا ہے، غالباً صحیح ہوتا ہے، اس کی خطا سے اس کا صواب زیادہ ہے تو حرج نہیں اور اگر دو نوں وجوہ علم سے عاری ہے صرف بطور خود اردو فارسی کتابیں دیکھ کر مسائل بتائے اور قرآن وحدیث کا مطلب بیان کرنے پر جرأت کرتا ہے تو یہ سخت اشد کبیرہ ہے۔

امام احمد رضا قادری

(فتاوی رضویہ ۲۳/ ۶۸۶)

مراسلت وترسیل زر کا پتہ

ملت کا ترجمان جام نور

۴۲۲ مٹیا محل، جامع مسجد دہلی

MILLAT KA TARJAMAN
JAAM-E-NOOR (Monthly)
422, Matia Mahal,
Jama Masjid, Delhi-110 006
Ph.: 011-29945883, 9717220944
E-mail : jnoormonthly@yahoo.com
k_noorani@yahoo.com
Website
www.newagemediacentre.com

نوٹ: آپ کو ملنے والے رسالے کے لفافے پر (پتے کے اوپر) اس شکل میں 3040/Jan-06-Dec.07 آپ کی ممبری فیس کی مدت لکھی ہوئی ہے، براہ کرم رسالہ پڑھنے سے قبل اسے دیکھ لیں، اگر آپ کی ممبری فیس ختم ہوگئی ہو تو اولین فرصت میں تجدید کرا لیں، ورنہ ہم آپ کو رسالہ بھیجنے سے معذور ہوں گے۔ ادارہ

ڈرافٹ اس نام سے بنوائیں

MILLAT KA TARJAMAN JAAM-E-NOOR

فی شمارہ :	15/=
زر سالانہ :	170/=
قیمت پاکستان میں	50/=
بیرون ملک (ہوائی ڈاک)	30 $ امریکی ڈالر
	20 £ پونڈ
لائف ممبر شپ (اندرون ملک)	5000/=
لائف ممبر شپ (بیرون ملک)	300 $ امریکی ڈالر

پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر غلام ربانی نے اسٹار آفسیٹ A/2229 احاطہ کجن بی، روڈ گران، لال کنواں، دہلی ۶ سے طبع کرا کر آفس "ماہنامہ ملت کا ترجمان جام نور" ۴۲۲ مٹیا محل جامع مسجد، دہلی ۶ سے شائع کیا

مشمولات

مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں۔

اداریہ

خوشتر نورانی

قدامت پرستی اور تجدد پسندی سے نجات کے لیے

اسلام کی معتدل تعبیر کی ضرورت!

کہا جاتا ہے کہ ’’عبارت Text خود نہیں بولتی، اس لیے اس کے پڑھنے والے اس کی مختلف توجیہ وتشریح کرتے ہیں۔‘‘ معاصر دنیا میں اسلامی مآخذ ومراجع اور اس کی تاریخ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ’’صحیح اسلام‘‘ کی تعبیر وتشریح میں آج جو کتابیں اور مضامین آرہے ہیں، ان کے مطالعے سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ داخلی سطح پر مسلمان کس فکری بحران سے دوچار ہیں۔ اسلام پر لکھی جانے والی ان سیکڑوں تحریروں سے اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ مسلکی اور مشربی امتیازات سے بالاتر علما اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ اسلام کی تعبیرات، شریعت کی تشریحات اور مسلم امہ کی ذہنی تشکیل کے سلسلے میں دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔

ایک طبقہ قدامت پرستی اور قدماء کی عقیدت میں اس قدر جامد ہے کہ کسی فرعی فقہی مسئلہ میں اختلاف رائے کو بھی گمرہی قرار دیتا ہے۔ سیاسی، معاشی، جمہوری اور سیاسی انقلابات سے ناواقفیت اور زمان ومکان کے تغیر سے بے نیازی کے ساتھ یہ طبقہ اسلام کی جو تعبیر پیش کر رہا ہے وہ معاصر مسلمانوں کی دینی تفہیم میں رکاوٹ کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اسلام کے دین کامل ہونے کی جو توجیہ مفسرین نے بیان کی ہے وہ ہے اس کی ہمہ گیریت، آفاقیت اور یسر، جس کا دوٹوک مفہوم یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہیں، قیامت تک کے لیے قابل انطباق Applicable ہیں اور حالات، زمانے اور ماحول کے زیر اثر پیدا ہونے والے مسائل کا قابل عمل حل اپنے اندر رکھتی ہیں۔ لیکن اسلام کی جو تعبیرات وتشریحات مذکورہ طبقے کے ذریعہ منظر عام پر آرہی ہیں وہ اسلام کی کاملیت، ہمہ گیریت اور آفاقیت کے مفاہیم سے متصادم ہیں۔ اس تصادم کی وجہ سے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ اس طرح ہیں:

۱- داخلی سطح پر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ علماء سے برگشتہ ہو گیا ہے، جس کے سبب علما کا ذاتی وقار اور ان کی مذہبی قدریں مسلم سماج سے رخصت ہو رہی ہیں جو بالواسطہ اسلام سے دوری کی وجہ بن گئی ہے۔

۲- بلاتفریق مذہب وملت عام ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو رہی ہے کہ دیگر مذاہب کی طرح اسلامی تعلیمات بھی Outdated ہیں اور نو پید مسائل کا قابل نفاذ حل نہیں رکھتیں۔

۳- ذرائع ابلاغ (میڈیا) کو اسلامی قوانین اور نظریات کے خلاف محاذ آرائی کا موقع مل رہا ہے، اس طرح عالمی سطح پر اسلام کی آفاقیت پر سوالیہ نشان قائم کیا جا رہا ہے۔

۴- اسلامی تعلیمات جن کی اساس محبت، رواداری، مساوات، انسانیت، حکمت بالغہ اور امن پر قائم ہے، اسلام کی ان نئی تعبیرات میں یہ اساس مفقود ہو گئی ہے۔ نتیجے کے طور پر دعوت وتبلیغ کا تصور امت کے دماغ سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔

۵- فروعی مسائل فرضیت کے دائرے میں آگئے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کی بنیادی تعلیمات پر امت مسلمہ کا ارتکاز ختم ہو رہا ہے اور مستحبات کو غایت دین سمجھا جا رہا ہے۔ اس عمل نے امت کو گروہ در گروہ میں تقسیم کر دیا ہے اور ایک ہی مسلک ومنہاج پر چلنے والے آپس میں دست وگریباں ہیں۔

۶- مدارس سے فارغ ہونے والی علماء کی نئی نسل اور قدیم علما کے درمیان تناؤ کی صورت پیدا ہو گئی ہے، یہ نسل ان کی فکری تشریحات کو نہ قبول کرنے کو تیار ہے اور نہ ان کے علمی سرمایے کو اپنے بعد آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کی آرزومند۔

اسلام کے حوالے سے امت کے مختلف طبقوں کے درمیان یہ صورت حال عام ہے جو ظاہر ہے کہ اسلام کی توسیع، مسلم سوسائٹی میں شریعت کی بالادستی اور دینی اقدار وروایات کے تحفظ کے لیے خطرے کا الارم ہے۔

مسلم سوسائٹی میں دوسرا طبقہ اسلام کی مادر پدر آزاد تعبیرات وتوضیحات کرنے والا تجدد پسندوں کا ہے۔ یہ گروپ اسلامی قوانین اور اس کی

تعلیمات کے حوالے سے علماء کی بالعموم ملوکانہ ادوار کی تشریحات کے ردعمل میں سامنے آیا ہے- ان کا ردعمل فکری جارحیت پر مبنی ہے کہ خدا کے کلام اور رسول کی سنت کے علاوہ کوئی چیز تحلیل و تجزیہ سے بالاتر نہیں اور وقت آگیا ہے کہ ہم چودہ صدیوں پر محیط اپنے دینی ورثے پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور انھیں کالعدم قرار دے کر براہ راست اسلامی مآخذ سے استفادہ کریں- ظاہر ہے کہ یہ فکر اباحیت پسندی، اجماع سے انحراف، اسلاف بیزاری، بے اصولی، سرمایۂ اسلامی میں تشکیک اور دین کے سیکولرائزیشن کی دعوت ہے، جسے کم از کم بالغ ذہن قبول نہیں کرسکتا- لیکن مستقبل میں عام مسلمانوں کو داخلی سطح پر سب سے بڑا خطرہ اسی طبقے سے ہے- ابھی مسلم سوسائٹی میں ان کے اثرات بہت نمایاں نہیں ہیں، مگر یہ طبقہ جس منظم اور موثر انداز میں اپنے افکار کی توسیع میں سرگرم ہے، ان پر توجہ نہیں دی گئی تو مسلم سماج پر ان افکار کے جو اثرات مرتب ہوں گے وہ کچھ ایسے ہوں گے:

۱- ہر زید، بکر اور عمر دین کی من چاہی تعبیر کرے گا، کیوں کہ اسلام کے چودہ سو سالہ فکری و علمی وراثت پر اعتماد قائم نہیں رہا-

۲- وہ مسائل جن پر جمہور علماء کا اتفاق ہو چکا ہے، ان سے انحراف عام سی بات ہوگی-

۳- عام مسلمانوں میں عدم تقلید کا رجحان فقہی ذخائر سے بے نیاز کردے گا اور یہ بے نیازی عام مسلمانوں کو فقہاء اور ائمہ مجتہدین کی اہانت پر اکسائے گی-

۴- اسلام کا دوسرا بنیادی ماخذ احادیث رسول کا سرمایہ ہے- یہ سرمایہ اسانید اور فن رجال کی کسوٹی سے گزر کر ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچا ہے، جب ناقدین حدیث کی وہ کسوٹی ہی ناقابل اعتماد ٹھری تو پھر مسلمانوں کے درمیان حدیثی سرمایہ میں تشکیک کے رجحان کا فروغ پانا تعجب خیز امر نہیں ہوگا-

۵- احادیث پر تشکیک کا مطلب ہے قرآنی اعتقادیات پر تشکیک- اس طرح یہ بے سمتی، تجدد اور بے اصولی صرف اسلام کے چودہ سو سالہ علمی و فکری ورثے کو کالعدم ہی نہیں قرار دے گی بلکہ دین حنیف کی اساس کو ہی معطل کردے گی، اس کے بعد اسلام کے نام پر جو دین ہمارے پاس ہوگا وہ دین محمدی نہیں بلکہ اس کا سیکولرائزڈ ایڈیشن ہوگا-

مشکل یہ ہے کہ مذکورہ دونوں طبقے کو ہی اپنی درستی اور صالحیت پر جس قدر اصرار ہے، دوسری کی گمرہی پر اس سے زیادہ یقین- جب تک یہ دونوں گروہ اسلام کی اعتدال پسندانہ تعلیمات و روایات کی روشنی میں اپنا محاکمہ نہیں کرتے انھیں اندازہ نہیں ہوسکتا کہ پوری امت کو وہ کس فکری بحران سے دوچار کر رہے ہیں اور بیک وقت وہ دین کی آفاقیت اور اپنے چودہ سو سالہ تہذیبی ورثے کو کس قدر مجروح اور محدود کر رہے ہیں- ساتھ ہی بالواسطہ لوگوں کی اسلام سے برگشتگی کی راہ ہموار کر رہے ہیں-

مسئلہ یہ ہے کہ تشدد کے ان دونوں کناروں کے خلاف ہمارے پاس احتجاج کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ افکار کو احتجاج، مخالفت اور تشدد سے نہیں دبایا جاسکتا- ایک فکر کی کاٹ اس سے محکم فکر کے توسط سے ہی ممکن ہے- پریشانی یہ ہے کہ اب تک قدیم صالح و جدید نافع کے حامل ایسے افراد سامنے نہیں آسکے ہیں جو ان دونوں انحرافات سے ہٹ کر راہ اعتدال کی علمی، فکری، لٹریری و تحریکی خاکہ پیش کرسکیں جو ماضی کے صالح ورثے کا بھی حامل ہو، حال کی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے والا ہو اور مستقبل میں انسانیت کو درپیش چیلنجیز کا صحیح اسلامی و انسانی حل بھی فراہم کرنے والا ہو- یہ سوال قائدین امت اور داعیان اسلام سے ایک ہمہ گیر بیداری، گہرے تفکر اور عملی پیش رفت کی دعوت دے رہا ہے- کیا خیر امت ہونے کا احساس ہمیں اس سمت بڑھنے کے لیے آمادہ کرسکے گا؟ □□□

> ”افکار کو احتجاج، مخالفت اور تشدد سے نہیں دبایا جاسکتا“
>
> ”ایک فکر کی کاٹ اس سے محکم فکر کے توسط سے ہی ممکن ہے“

آپ کے اور کون ہے جس کے سامنے یہ سرمایہ پیش کرسکوں)

اردو شعر وادب میں مفتی صاحب کا مرتبہ جگ ظاہر ہے، استاذ مطلق غالباً اردو میں طبع آزمائی نہیں فرماتے تھے، مگر غالب جیسے مشکل پسند کو ٹھکانے کے شعر کہنے پر آمادہ کرنا علامہ ہی کا کارنامہ ہے (۵) بقول مولوی محمد حسین آزاد غالب کا موجودہ اردو دیوان علامہ اور مرزا خانی ہی کا انتخاب ہے۔(۶)

سیف اللہ المسلول اعلیٰ شعری ذوق کے مالک تھے، علم وفضل، بزرگی اور خدار سیدگی کے ساتھ ذرا شعر کا یہ رنگ ملاحظہ کریں، فرماتے ہیں:

تم جسے چاہو چڑھا لو سر پر
ورنہ یوں دوش پہ کاکل ٹھہرے
ہم جو چپ بیٹھیں تو کہلائیں سڑی
شیخ بیٹھیں تو توکل ٹھہرے
حسن الفاظ ہے کس حور لقا کا صدقہ
ہے یہ انداز سخن، کس کی ادا کا صدقہ
پاؤں پھسلا تو دیا اس نے مرے ہاتھ میں ہاتھ
ید بیضا ہے یہاں لغزش پا کا صدقہ
یوں بہانے بھی نہ آنے کے بنا سکتے ہو
پر جو آنے ہی پہ آجاؤ تو آسکتے ہو(۷)

(۳) علامہ اور مفتی صاحب میں ایک رشتہ استاذ بھائی کا بھی تھا، اولاً دونوں حضرات مولانا فضل امام خیر آبادی کے تلمیذ تھے، پھر خاندان ولی اللہی سے نسبت تلمذ رکھنے میں دونوں حضرات شریک ہیں۔

(۴) شاہ اسماعیل دہلوی صاحب نے جب تقویۃ الایمان لکھ کر ہندستان میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے افکار وعقائد کو عام کرنا شروع کیا تو ان تینوں نے اس کے خلاف قلم اٹھایا، گویا "رد وہابیت" بھی ان تینوں حضرات کی مشترکہ دلچسپی کا موضوع ہے۔

(۵) انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے یہ تینوں حضرات سرکاری ملازمت سے وابستہ ہونے کے باوجود ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف صف آرا ہوگئے، استاذ مطلق کے مجاہدانہ کردار سے سب واقف ہیں، علامہ کے اسی فتویٔ جہاد پر مفتی صاحب نے بھی دستخط کیے، جس کی پاداش میں نظر بندی اور جائداد کی ضبطی کا شکار ہوئے، انقلاب ۵۷ء میں استاذ مطلق کے شانہ بشانہ جہاد کرنے کے لیے سیف اللہ المسلول نے اپنے بیٹے کی طرح پالے ہوئے عزیز ترین بھانجے اور شاگرد مولانا فیض احمد بدایونی کو علامہ کے ساتھ کردیا، چنانچہ علامہ کے مشہور فتویٔ جہاد پر مولانا فیض احمد بدایونی نے بھی دستخط کیے اور مردانہ وار جنگ آزادی میں حصہ لیا۔

یہ تمام وہ امور مشترک ہیں جو ان تینوں حضرات کو مزاج ومذاق، مسلکی میلان، ادبی رجحان، سیاسی خیالات اور اتحاد ویگانگت کے ایک نقطے پر جمع کردیتے ہیں اور یہی نقطۂ اتحاد ان تینوں حضرات میں محبت، خلوص، بے تکلف دوستانہ مراسم، ایک دوسرے کے لحاظ وپاس، عزت واحترام، قدر ومنزلت، قدر شناسی اور قدر دانی کی بنیاد ہے۔ زیر نظر مضمون میں ہم انہیں مراسم خلوص ومحبت پر روشنی ڈالیں گے۔

استاذ مطلق ریاست الور میں:۔ استاذ مطلق لکھنؤ سے ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء کے ابتدائی مہینوں میں ریاست الور تشریف لے آئے، مفتی صاحب نے فوراً ایک نظم کہہ کر علامہ کی خدمت میں روانہ کردی، نظم کا ایک شعر سن لیں:

رشک تہران وصفاہاں شدہ دلی از من
الور از ذات ہمایون تو یوناں باشد

(ترجمہ: میری بدولت دہلی رشک تہران واصفہان بنا ہوا ہے جب کہ آپ کے الور جانے سے الور یونان بن گیا ہے)

حکیم محمود احمد برکاتی صاحب نے اس پر دلچسپ ریمارک دیا، لکھتے ہیں:

"شرافت المکان بالمکین کی صداقت دیکھیے کہ برعظیم کے مراکز علمیہ میں الور نامی کسی مقام کا کوئی ذکر نہیں تھا، مولانا فضل حق وہاں پہنچ گئے تو ان کی ذات ہمایوں نے الور کو یونان بنادیا۔ سچ ہے..... ع

ہم جہاں بیٹھ کے پی لیں وہیں مے خانہ بنے

اور

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا

آج وہاں الافق المبین، شرح اشارات محاکمات، قاضی مبارک جیسی کتابیں معرض تدریس میں ہیں"۔(۸)

الور کے زمانہ قیام میں ہی سیف اللہ المسلول نے اپنے صاحبزادے تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی کو استاذ مطلق کی خدمت میں منطق وفلسفہ کی بعض منتہی کتابوں کی تحصیل کے لیے بھیجا، جن دنوں تاج

الخول علامہ کی درسگاہ سے فیضان علمی حاصل کر رہے تھے انہی دنوں علامہ اپنے ایک مکتوب (بنام مولانا سلطان حسن خاں صدر الصدور مؤرخہ ۵/ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ) میں لکھتے ہیں:

''اعز از جاں مولوی عبدالقادر شرح اشارات ومحاکمات وشرح قاضی وحاشیہ می خوانند وفہم درست دارند'' (۹)

(ترجمہ: عزیز تر از جاں مولوی عبدالقادر شرح اشارات، محاکمات ،شرح قاضی اور حاشیہ پڑھ رہے ہیں اور اچھی سمجھ رکھتے ہیں)

لطیفہ:- حضرت تاج الفحول کے قیام الور کے دوران ایک لطیفہ درپیش آیا جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا (یہ روایت ہمارے خاندان میں چلی آرہی ہے اور اس کا تذکرہ ذرا مختلف انداز میں عم محترم مولانا ہادی القادری صاحب نے بھی اپنی کتاب ''احوال ومقامات'' میں کیا ہے) ہوا یہ کہ ایک رات تاج الفحول کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اچانک استاذ مطلق وہاں ٹہلتے ہوئے آگئے، آپ نے شاگرد کو مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا عبدالقادر کون سی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہو؟ شاگرد نے ادب سے جواب دیا کہ ''دن میں وقت نہیں ملا تھا اب دلائل الخیرات کا حزب مکمل کر رہا ہوں'' اس جواب پر استاذ نے فرمایا کہ ایسی کتابیں تو تمہارے والد صاحب اچھی پڑھا سکتے ہیں یہ انہیں سے پڑھ لیا کرو، جب بدایوں آکر اس بات کا تذکرہ اپنے والد ماجد سیف اللہ المسلول سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ ''تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ میرے والد تو وہ کتابیں بھی اچھی پڑھا سکتے ہیں جو آپ پڑھاتے ہیں''۔

اس قسم کے واقعات اکابر کے بے تکلف رشتہ خلوص ومحبت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بے مرچ کی کھیر:- اسی قسم کا ایک دلچسپ لطیفہ دہلی میں مفتی آزردہ صاحب کے دولت کدے پر پیش آیا، سیف اللہ المسلول دہلی تشریف لے گئے تو مفتی آزردہ نے آپ کی دعوت کی، دہلی والے مرچ مسالے بہت زیادہ کھاتے ہیں، حضرت اس قسم کے کھانوں کے عادی نہیں تھے، آپ جو بھی چیز اٹھاتے اس میں تیز مرچ ہوتی، آخر آپ کی نظر کھیر کے پیالے پر پڑی، حضرت نے بڑی سادگی سے مفتی صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''مفتی صاحب اگر آپ کی یہ کھیر بے مرچ کی ہو تو ذرا اٹھا دیں''، اس جملہ پر پوری محفل زعفران زار ہوگئی۔ (۱۰)

استاذ مطلق بدایوں میں:- سیف اللہ المسلول کا خاندان تو ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے ہی بدایوں میں قیام پذیر تھا، مگر بدایوں کو استاذ مطلق سے بھی ایک گونہ نسبت حاصل ہے، گو دور ہی کی سہی، ''ماہر خیر آبادیات'' حکیم محمود احمد برکاتی صاحب لکھتے ہیں:

''ویسے مولانا فضل امام خیر آبادی کا خاندان اصلاً بدایونی ہی تھا، مولانا ضیاء القادری نے تو اگرچہ مولانا فضل امام کے والد محمد ارشد کے لیے لکھا ہے کہ وہ بدایونی تھے اور خیر آباد منتقل ہو گئے تھے، مگر یہ حقیقت نہیں ہے، بلکہ مولانا فضل امام کے اجداد میں سے ایک بزرگ قاضی عمادالدین بدایوں سے ہرگام منتقل ہوئے تھے، مولانا محمد ارشد ہرگام میں ہی پیدا ہوئے اور وہاں سے خیر آباد منتقل ہوئے تھے، مختصر یہ کہ اصل پر نظر کی جائے تو دونوں (سیف اللہ المسلول اور استاذ مطلق) بدایونی ہیں مگر بات ذرا دور کی ہے''۔ (۱۱)

سیف اللہ المسلول سے مراسم محبت ویگانگت استاذ مطلق کو بدایوں کھینچ لائے، ممکن ہے بدایوں کے سفر کے پیچھے اپنے قدیم وطن کو دیکھنے کی خواہش بھی شامل ہو، بہر حال استاذ مطلق بدایوں تشریف لائے اور مدرسہ قادریہ میں فروکش ہوئے، مولانا ضیاء القادری نے اکمل التاریخ میں لکھا ہے کہ:

''حضرت سیف اللہ المسلول سے آپ (استاذ مطلق) کو نہایت خلوص وعقیدت تھی، ایک زمانے میں بدایوں بھی تشریف لائے تھے، اکثر اوراد واشغال کی اجازتیں بھی حاصل کی تھیں، مدرسہ قادریہ میں مقیم رہے تھے''۔ (۱۲)

علم وفضل اور خدمات کا اعتراف:- سیف اللہ المسلول نے اپنی تصانیف میں متعدد مقامات پر استاذ مطلق کے علم وفضل اور خدمات کا اعتراف کیا ہے، سیف الجبار میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

''مولوی فضل حق خیر آبادی جزاہ اللہ خیراً کہ علم وفضل میں مولوی اسماعیل وغیرہ کو ان سے کچھ نسبت نہیں، علوم عقلیہ ونقلیہ اپنے والد ماجد سے کہ یگانۂ عصر تھے حاصل کیے، مولوی اسماعیل کے روبرو ان کا رد وابطال کیا اور تکفیر کی نوبت تحریر کی آئی، مسئلہ شفاعت میں مولوی اسماعیل نے حرکت مذبوحی کچھ جواب میں کی، آخر کو عاجز وساکت ہو گئے اور ''تحقیق الفتویٰ فی رد اہل الطغویٰ'' کمال شرح وبسط سے مولوی فضل حق صاحب نے لکھا'' (۱۳)

اپنی ایک دوسری کتاب فوز المومنین میں تحریر فرماتے ہیں:

''شفاعت کے بیان میں جو مولوی اسماعیل دہلوی نے لکھا، ان کے روبرو اس کا رد ہوا، مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی جزاہ اللہ خیراً نے تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ کمال شرح وبسط سے لکھا اور مولوی اسماعیل کی تکفیر ثابت کی اور علمائے دین دار کی اس پر مہریں ہوئیں اور کچھ جواب اس کا نہ ہوسکا''۔(۱۴)

المعتقد المنتقد میں ایک بحث کے بعد لکھتے ہیں:

''والنظر الی الاختصار منعنا من التفصیل ومن شاء فلیرجع الی افادات الفاضل الکامل الاجل الابجل المولی فضل الحق الخیر آبادی وھو بارض الھنداول من جرح مبتدعات النجدیة ومفاسدھم، وآخر من بیّن شرح فسادعقائدھم فاطمئن قلوب اھل الیقین وحصل الیقین للشاکین والمترددین وھدی اللہ به کثیرامن الضالیین ،وله منة علی کافة المسلمین واجر جزیل عند رب العالمین''(۱۵)

(ترجمہ: اختصار کے پیش نظر ہم تفصیل سے گریز کرتے ہیں اور جو اس مسئلے میں تفصیل کا خواہش مند ہو وہ فاضل کامل معظم و محترم مولانا فضل حق خیرآبادی کے افادات کی طرف رجوع کرے، سرزمین ہند پر وہ پہلے شخص ہیں جس نے نجدیوں کی بدعتوں اور مفاسد کا رد کیا اور آخری شخص ہیں جس نے ان کے عقائد کا فساد ظاہر کیا، تو اہل یقین کے دل مطمئن ہوئے اور شک وتردد والوں کو یقین کی دولت حاصل ہوگئی اور ان کے سبب اللہ نے بہت سے گمراہوں کو ہدایت دی اور تمام مسلمانوں پر ان کا یہ احسان ہے اور رب العالمین کی بارگاہ میں ان کے لیے بڑا اجر ہے)

کتابوں پر تقریظات:- ان حضرات میں روابط وتعلقات کے استحکام ہی کا نتیجہ ہے کہ ان حضرات نے ایک دوسرے کی کتابوں پر تقریظیں تحریر فرمائیں اور ایک دوسرے کے علم وفضل کا کشادہ قلبی سے اعتراف کیا۔

۱۲۷۲ھ میں مکہ مکرمہ کے ایک عالم کی فرمائش پر سیف اللہ المسلول نے عربی زبان میں علم کلام وعقائد کی معرکہ آرا کتاب المعتقد المنتقد تصنیف فرمائی، اس کتاب پر استاذ مطلق اور صدرالصدور دونوں حضرات نے تقریظیں تحریر فرمائیں، حضرت استاذ مطلق تحریر فرماتے ہیں:

فقد طالعت الرسالة التی صنفھاو رصفھامولانا الاودع الاروع الاورع، الفارع المتفرع، الضارع المتضرع، ذوالمناقب الثواقب الجلیلة، والانظار الثواقب الدقیقة، الجامع بین العلوم العقلیة والنقلیة، ومعارف الشریعة والحقیقة، طلاع الثنایا والنجاد، ذائع الصیب فی انجاد الحق وفل قرن طلع من النجد فی الاغوار والانجاد، العریف العرّیف، الشریف الغطریف، الصفی الخفی، الحصی الحفی مولانا المولوی فضل الرسول القادری الحنفی متع اللہ المؤمنین بطول بقائه وصانه فی حرزه ووقائه(۱۶)

اس کتاب پر مفتی صاحب نے بھی زوردار تقریظ تحریر فرمائی اور پُر زور الفاظ میں المعتقد میں درج عقائد ومسائل کی تائید فرمائی، آپ لکھتے ہیں:

وبعد فانی نظرت فی الرسالة البالغة، والعجالة النافعة التی الفھا الحبر المدقق، النحریر المحقق، الفاضل الکامل، العالم الفائق، البحر الخضم، الالمعی اللوذعی، الاحوذی الاصمعی مولانا المولوی فضل الرسول البدایونی القرشی القادری(۱۷)

پھر آگے لکھتے ہیں: وجدتھا اجود لفظاً، واحسن معناً، واغر نظماً، وازھر حکماً، وارفع شاناً، وامنع مکاناً، لایدانیھاکتاب قد صنف فی علم الکلام، ولا یساویھارسالة قد الفت فی ھذاالمرام(۱۸)

(ترجمہ: میں نے اس رسالے کو لفظ ومعنی کے اعتبار سے عمدہ اور بہترین، نظم وترتیب کے اعتبار سے چمکتا دمکتا اور رفیع الشان پایا، علم کلام میں تصنیف کی جانے والی کوئی کتاب اس کے قریب نظر نہیں آتی اور اس موضوع پر تالیف کیا جانے والا کوئی بھی رسالہ اس کے برابر نہیں ہے)

مفتی صدرالدین آزردہ نے روضہ رسول ﷺ کی زیارت کے موضوع پر ۱۲۶۴ھ میں ''منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال'' نامی رسالہ تصنیف فرمایا جو اسی سال شائع ہوا، اشاعت اول کے چار سال بعد ۱۲۶۸ھ میں پھر یہ رسالہ شرف المطابع دہلی سے دوبارہ شائع ہوا، اس پر استاذ مطلق علامہ خیرآبادی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی نے تقریظیں تحریر فرمائیں۔ استاذ مطلق اپنے مخصوص اسلوب میں تحریر فرماتے ہیں:

فقد انتھی الی منتھی المقال فی شرح حدیث لا تشد

الرحال الذی صنفه ورصفه من تشد الیه الرحال لتحل عقد الاعضال وتساق الیه عناق........ (لفظ نہیں پڑھا جاسکا) لتعرف مایروی من الاحادیث بالاسناد والارسال وتناخ بجنابه مطایا النزال لنیل المعارف والعوارف بالتفصیل والاجمال احب الاخلال الرضی الخلال الذکی الزکی الخصال القسمین الیمین والشمال ملاک الکمال الباجل البجال الفاضل الفضال الامثل الاجل عن الامثال فی الفضل والآثال مولانا المولوی محمد صدرالدین خان بهادر لا زال فی بال واقبال-(۱۹)

فتاویٰ کی تصدیق:-۱۲۴۰ھ میں استاذ مطلق نے شاہ اسماعیل دہلوی صاحب کی کتاب تقویۃ الایمان کی بعض عبارتوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کے خلاف فتویٰ کفر صادر فرمایا جو "تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ" کے نام سے منظر عام پر آیا، اس فتوے پر دہلی کے مشاہیر علما مولانا مخصوص اللہ دہلوی، مولانا محمد موسیٰ دہلوی اور مولانا احمد سعید نقش بندی کے علاوہ مفتی صدرالدین آزردہ نے بھی تائیدی دستخط ثبت فرمائے-

۱۲۶۸ھ میں ہندستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بعض اختلافی مسائل کے تصفیہ کے لیے سیف اللہ المسلول کی بارگاہ میں استفتا کیا، آپ نے تمام سوالات کا تحقیقی جواب تحریر کیا، جو اسی سال مطبع مفید الخلائق دہلی سے شائع ہوا، اس فتوے پر اعلمائے دہلی نے تائیدی دستخط فرمائے جن میں سب سے پہلے دستخط مفتی صدرالدین آزردہ نے ثبت کیے اور حضرت کے اس فتوے کی تائید فرمائی-

۱۲۶۹ھ میں مولانا حیدر علی ٹونکی کے خلاف استاذ مطلق نے ایک فتویٰ صادر فرمایا، اس پر بھی دیگر مشاہیر کے ساتھ مفتی آزردہ کے تائیدی دستخط موجود ہیں، اس فتوے کی باقی تفصیلات آگے آرہی ہیں-

حق کا دفاع:-ان تینوں حضرات کے باہمی تعلقات محبت والفت محض اللہ ورسول اور دین کی خاطر تھے، اس لیے اگر کسی پر کوئی حملہ ہوتا تو اس کو "حق" پر حملہ سمجھتے ہوئے یہ ایک دوسرے کا علمی دفاع کرتے تھے، استاذ مطلق کے مذکورہ فتوے کے رد میں مولانا حیدر علی ٹونکی نے ایک کتاب کلام الفاضل الکبیر علیٰ اھل التکفیر قلم بند کی، تو اس کے جواب میں سیف اللہ المسلول نے قلم اٹھایا اور فارسی زبان میں ایک رسالہ "تبکیت النجدی" تحریر فرما کر مولانا حیدر علی ٹونکی کے اعتراضات کا تحقیقی جواب دیتے ہوئے استاذ مطلق کا دفاع کیا-

اسی طرح مفتی صاحب کے رسالے منتہی المقال پر کسی صاحب نے سات سوالات قائم کیے، ان سوالات کے جواب میں سیف اللہ المسلول نے ایک تحقیقی رسالہ قلم بند فرمایا جس کا تاریخی نام "اکمال فی بحث شد الرحال" قرار پایا، یہ رسالہ فارسی میں ہے اور پہلی بار مطبع الہی سے ۱۲۶۶ھ میں طبع ہوا، اس رسالے میں حضرت نے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی صاحب پر کیے جانے والے اعتراضات کا تحقیقی جواب دیا ہے-

ایک مضحکہ خیز روایت:-بات سیف اللہ المسلول اور استاذ مطلق کے تعلقات وروابط کی چل رہی ہے تو اسی ضمن میں ایک غلط فہمی یا غلط بیانی کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے- کچھ عرصہ پہلے پاکستان سے چھپی ہوئی ایک کتاب نظر سے گزری تھی (۲۰) اس میں مصنف نے ایک بڑی مضحکہ خیز روایت لکھی تھی، فرماتے ہیں کہ علامہ فضل حق خیرآبادی انڈمان جانے سے پہلے شاہ اسماعیل دہلوی کے خلاف دیے گئے اپنے فتوے پر بڑے نادم تھے اور شاہ اسماعیل دہلوی کے علم وفضل اور تقویٰ وللہیت کے ذکر کے ساتھ اپنے فتویٰ کفر پر پشیمانی کا اظہار کر رہے تھے، جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے شاہ صاحب کے خلاف فتویٰ کیوں دیا تو علامہ نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ میں تو شاہ اسماعیل دہلوی کا رد لکھنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے مولوی فضل رسول بدایونی نے بہکا دیا تھا- (مفہوم عبارت)

اولاً تو یہ بے پر کی روایت بے حوالہ وسند لکھی گئی ہے اور اگر اس کا کوئی حوالہ ہو تب بھی معاصر شہادتوں، تاریخی قرائن اور درایت کی روشنی میں اس روایت کو ناقابل قبول قرار دینے کے بہت سے دلائل موجود ہیں- علامہ فضل حق خیرآبادی کسی ایسی شخصیت کا نام نہیں ہے جو کسی کے بہکاوے میں آ کر کسی کے خلاف فتویٰ دے ڈالے اور پھر فتویٰ بھی کسی فرعی معاملہ میں نہیں بلکہ ایسے معاملے میں جس کا تعلق کفر واسلام سے ہو، جس میں انتہائی احتیاط اور تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری بات یہ کہ یہ فتویٰ ۱۲۴۰ھ میں صادر کیا گیا تھا یہ وہ وقت تھا جب سیف اللہ المسلول علم طب کی تحصیل کر کے آئے تھے اور درس وتدریس میں مشغول تھے، شاہ اسماعیل دہلوی کے رد وابطال کی طرف تو آپ

۱۲۶۰ھ کے بعد متوجہ ہوئے، اس وقت تک استاذ مطلق تحقیق الفتویٰ اور رسالہ امتناع نظیر لکھ چکے تھے۔

نواب صدیق حسن خاں کی ایک روایت:۔ خیر یہ تو ایک غیر معروف مصنف کی بے حوالہ بات تھی مگر حیرت تو جب ہوتی ہے کہ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی جیسے "ثقہ" مصنفین بھی "می پرانند" کا شکار ہو جائیں، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے کچھ عرصہ مفتی صدرالدین آزردہ سے بھی تحصیل علم کی تھی، اپنے استاذ اور علامہ فضل حق کے درمیان تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے نواب صاحب ابجد العلوم میں لکھتے ہیں:

وكان بينه وبين استاذى العلامة محمد صدر الدين خان الدهلوى صدر الصدور بها مودة اكيدة ومحبة شديدة لانهما كانا شريكين فى الاشتغال على استاذ واحد وعلى ابيه الفاضل فضل امام ومع ذلك يسخط استاذى عليه فى بعض امور منها رده على الشيخ الحافظ الواعظ المحدث الاصولى الحاج الغازى الشهيد محمد اسماعيل الدهلوى ويقول لا ارضى منك ذلك وليس هذا بعشك (۲۱)

(ترجمہ: علامہ فضل حق اور میرے استاذ علامہ محمد صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور کے درمیان بڑی دوستی اور محبت تھی، کیوں کہ وہ دونوں ایک ہی استاذ کی درسگاہ کے فیض یافتہ تھے اور پھر علامہ فضل حق کے والد علامہ فضل امام خیرآبادی کے بھی دونوں شاگرد تھے، لیکن اس (استاذ بھائی ہونے) کے باوجود میرے استاذ بعض معاملات میں ان سے ناراض رہتے تھے، ان میں ایک معاملہ یہ تھا کہ انہوں (علامہ فضل حق) نے شیخ حافظ محدث اصولی حاجی غازی شہید محمد اسماعیل دہلوی کا رد کیا تھا، (مفتی صاحب علامہ خیرآبادی سے) کہا کرتے تھے کہ میں اس معاملہ میں تم سے خوش نہیں ہوں اور یہ تمہیں زیب نہیں دیتا)

نواب صاحب کی اس عبارت پر حکیم محمود احمد برکاتی صاحب نے بڑا عمدہ نوٹ لگایا ہے، پہلے اسے دیکھ لیں پھر ہم کچھ عرض کریں گے، حکیم صاحب فرماتے ہیں:

"ایک دوست کا دوسرے دوست کو ٹوکنا تو کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ مولانا آزردہ تو مولانا فضل حق کو اس بات پر برا بھلا کہیں کہ انہوں نے شاہ اسماعیل کا رد کیا تھا جب کہ

(۱) خود وہ شاہ اسماعیل کے خیالات سے متفق نہیں تھے اور بقول مولانا فضل رسول انہوں نے شاہ صاحب کو سمجھا کر اس سے باز رکھنا چاہا تھا۔
(۲) مولانا آزردہ تعیین یوم میلاد کے قائل تھے۔
(۳) مولانا قیام فی المیلاد کو بھی مستحسن جانتے تھے۔
(۴) منتہی المقال میں بھی وہ وہابی نقطۂ نظر کے خلاف گئے ہیں اور جوش وخروش کے ساتھ وہابیہ کا رد کیا ہے۔
(۵) امتناع نظیر کے باب میں بھی ان کا ایک قلمی رسالہ میرے کتب خانہ میں ہے، وہ اس میں بھی شاہ صاحب سے کلیتاً متفق نہیں تھے۔

ان حقائق کی موجودگی میں مَیں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ نواب صاحب کا اپنے استاذ پر افترا ہے کہ وہ مولانا فضل حق سے اس لیے ناراض تھے کہ انہوں نے شاہ صاحب کا رد کیا تھا اور مولانا فضل حق کے سلسلے میں لوگوں کو بدگمان کرنے کی ناکام کوشش ہے"۔ (۲۲)

حکیم صاحب کے مذکورہ دلائل کے علاوہ یہاں چند قابل ذکر پہلو اور بھی ہیں جن کی روشنی میں نواب صاحب کی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی، پہلی بات تو یہ کہ جب ۱۲۴۰ھ میں علامہ خیرآبادی نے شاہ اسماعیل دہلوی کے خلاف فتویٰ دیا تو اس پر مفتی صاحب نے تائیدی دستخط فرمائے، یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ مفتی صاحب علامہ خیرآبادی کے جس "جرم" پر ان سے ناراض ہوں خود اسی جرم میں ان کے شریک بھی ہوں؟ دوسرے یہ کہ اس فتوے کے ۲۹ سال بعد ۱۲۶۹ھ میں جب علامہ خیرآبادی نے شاہ اسماعیل دہلوی صاحب کے ایک حامی مولانا حیدر علی ٹونکی کے خلاف فتویٰ دیا جس میں شاہ صاحب کے امکان نظیر اور امکان کذب کے موقف کا زبردست رد تھا اس پر بھی مفتی صاحب نے تصدیق فرمائی، یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ۱۲۶۹ھ/ ۱۲۷۰ھ ہی وہ زمانہ ہے جب نواب صاحب دہلی میں مفتی آزردہ صاحب سے تحصیل علم کر رہے تھے۔ (۲۳)

تیسرے یہ کہ پھر ۱۲۷۲ھ میں (یعنی علامہ خیرآبادی کی وفات سے صرف ۶ سال قبل) مولانا فضل رسول بدایونی نے المعتقد المنتقد لکھی جس میں جگہ جگہ نام لے کر شاہ اسماعیل دہلوی صاحب کا رد کیا اس پر مفتی صاحب نے زوردار الفاظ میں تقریظ قلم بند فرمائی اور یہاں تک لکھ گئے کہ "علم کلام میں لکھی جانے والی کوئی کتاب اس کتاب کے برابر نہیں ہے" (۲۴)، سوال یہ ہے کہ اگر تحقیق الفتویٰ لکھ کر علامہ

خیرآبادی نے کوئی جرم کیا تھا تو پھر اس سے بڑا جرم تو مولانا فضل رسول بدایونی کا تھا جنہوں نے شاہ اسماعیل دہلوی کے رد میں ایک نہیں بلکہ ۶ر کتابیں تصنیف فرمائیں: ۱-سیف الجبار، ۲-البوارق المحمدیہ، ۳-فوز المؤمنین، ۴-احقاق حق، ۵-فصل الخطاب، اور ۶-المعتقد المنتقد- مفتی صاحب کو علامہ سے زیادہ تو سیف اللہ المسلول سے ناراض ہونا چاہیے تھا، اس کے برخلاف مفتی صاحب ان کو ان القاب وخطابات سے یاد فرمارہے ہیں:

الحبر المدقق، النحریر المحقق، الفاضل الکامل، العالم الفائق، البحر الخضم، الالمعی اللوذعی، الاحوذی الاصمعی مولانا المولوی فضل الرسول البدایونی القرشی القادری (۲۵)

ان تمام داخلی اور خارجی قرائن وشواہد کی روشنی میں پورے یقین سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نواب صاحب کی مذکورہ بات "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کی قبیل سے ہے-

سلسلہ مراسلت:- ان تینوں حضرات میں علمی سلسلہ مراسلت کا بھی پتہ چلتا ہے، جو ان حضرات کے باہم گہرے ربط وتعلق کی دلیل ہے، ہمارے علم میں ان حضرات کے مکاتیب کے دو مجموعے ہیں، یہاں ہم ان کا مختصر تعارف کروائیں گے- یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ ہمارے ناقص مطالعے کی حد تک مکاتیب کے ان دونوں مجموعوں کا ذکر غالباً علمی دنیا میں ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ اب تک اس کم ترین راقم الحروف کی محدود نظر سے ان حضرات کے جتنے تذکرے اور سوانح گزری ہیں کسی میں مکاتیب کے ان دونوں مجموعوں کی طرف اشارہ نہیں ہے-

استاذ مطلق نے عقول مجردہ میں لزوم اعتباریہ یا غیر اعتباریہ کے سلسلہ میں ایک علمی سوال قائم کیا اور اس کے حل کے لیے اپنے بعض بے تکلف احباب کو دعوت دی، مفتی صاحب نے اس کا جواب قلم بند کیا، استاذ مطلق نے مفتی صاحب کا جواب الجواب لکھ کر ارسال کیا اور ان تینوں خطوط کی ایک نقل سیف اللہ المسلول کو ارسال فرمادی، اس پر حضرت نے بدایوں سے جواب مرحمت فرمایا، آپ نے مفتی صاحب کے موقف کی تائید کی اور استاذ مطلق کے جواب الجواب پر بعض ایرادت پیش کیے، اس طرح یہ سلسلہ چلا اور آپس میں متعدد خطوط کا تبادلہ ہوا، یہ تمام خطوط فارسی میں ہیں اور رضا لائبریری رامپور کے شعبۂ مخطوطات میں "رویۃ الشمائل والغرائب فی انشاء المکاتب" کے نام سے ایک مجموعے میں محفوظ ہیں، آج سے ۱۲ر۱۳ سال پہلے جب مجھے معقولات سے بہت زیادہ شغف اور دلچسپی تھی تب میں نے رضا لائبریری میں دن بھر بیٹھ کر ان مکتوبات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور لطف اٹھایا تھا، ان کی بہت سی تفصیلات میں نے ڈائری میں نوٹ کی تھیں، فی الحال وہ ڈائری پیش نظر نہیں ہے کہیں کتابوں میں دب گئی ہے اس لیے اس پر زیادہ کچھ نہیں لکھا جاسکتا، اس مجموعے کا نام بھی میں نے حافظے کی مدد سے لکھا ہے جس میں مجھے تأمل ہے- عم محترم مولانا ہادی القادری صاحب نے بھی اس سلسلہ مکاتبت کی طرف اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

"حضرت معین الحق (سیف اللہ المسلول) قدس سرہ اور استاذ مطلق علامہ فضل حق خیرآبادی میں کوئی مباحثہ ہو رہا تھا، استاذ مطلق خط لکھتے، حضرت معین الحق خط سنتے اور جواب لکھاتے، چونکہ آخری زمانے میں آنکھ ضائع ہوگئی تھی، اس لیے ہر وقت ہر کام کے لیے عبدالقادر (تاج الفحول) کو ہی پکارا جاتا اور یہ فوراً خدمت بجالاتے، مگر جب استاذ مطلق کا خط ملتا تو پوچھتے یہاں عبدالقادر تو نہیں ہیں؟ خط سنتے وقت اور جواب لکھاتے وقت ان کو اس جگہ سے دور رکھتے کہ انہیں بہر حال اپنے استاذ کا ادب کرنا چاہیے، اب یہ تصورات خواب وخیال ہوگئے"- (۲۶)

دوسرے سلسلہ مکاتیب کا پس منظر سمجھنے کے لیے ذرا تفصیل میں جانا ہوگا، استاذ مطلق کی کتاب تحقیق الفتوی کے منظر عام پر آنے کے تقریباً ۲۵ر سال بعد مولانا حیدر علی ٹونکی نے اس کا جواب لکھا، اس میں انہوں نے امکان کذب باری کے مسئلے پر نہ صرف یہ کہ شاہ اسماعیل دہلوی صاحب کے موقف کی حمایت کی بلکہ اس کا دفاع کرتے ہوئے اپنی طرف سے بہت سے عجوبۂ روزگار دلائل شامل کردیے، ان کے اس رسالے کی بعض عبارتوں کی روشنی میں کسی صاحب نے ۱۵ر سوالات قائم کرکے استاذ مطلق کی خدمت میں استفتا کیا، علامہ نے اس کا تحقیقی جواب دیا جو مطبع ہدایہ دہلی سے ۱۲۶۹ھ میں شائع ہوا، اس پر مفتی آزردہ سمیت دہلی، رامپور اور مرآدباد وغیرہ کے ۳۰ر سے زائد علما نے تائیدی دستخط کیے، اس فتوے کا ایک نادر قلمی نسخہ استاذ مطلق کی مہر کے ساتھ کتب خانہ قادری بدایوں میں محفوظ ہے- اس فتوے میں چھٹے سوال کے جواب میں استاذ مطلق نے جو بات لکھی تھی اس پر مفتی صاحب کو

تامل ہوا، یہی تامل اس سلسلہ مکاتبت کی وجہ بنا جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس سلسلہ مکاتبت کی ایک نقل کتب خانہ قادری بدایوں میں محفوظ ہے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے-یہ کل ۷ رخطوط ہیں، متوسط سائز پر ایک صفحے میں ۲۰ سطریں ہیں-مکتوبات کی تفصیل درج ذیل ہے-

(۱) مکتوب مفتی آزردہ بنام استاذ مطلق-(تقریباً ایک صفحہ)
(۲) مکتوب استاذ مطلق بنام مفتی آزردہ-(تقریباً ساڑھے چھ صفحات)
(۳) مکتوب سیف اللہ المسلول بنام استاذ مطلق-(ساڑھے پانچ صفحات)
(۴) مکتوب مفتی آزردہ بنام سیف اللہ المسلول-(آدھا صفحہ)
(۵) مکتوب مفتی آزردہ بنام استاذ مطلق-(تین صفحات)
(۶) مکتوب استاذ مطلق بنام مفتی آزردہ-(ڈیڑھ صفحہ)
(۷) مکتوب استاذ مطلق بنام مفتی آزردہ-(دو صفحات)

ان مکتوبات کی علمی وفنی اہمیت ووقعت اپنی جگہ مگر یہ اس زاویہ سے بھی قابل توجہ ہیں کہ اکابر علما میں باہم کتنا احترام ولحاظ ہوا کرتا تھا، ان خطوط میں جن الفاظ میں اور جس اسلوب میں ان حضرات نے ایک دوسرے کو مخاطب کیا ہے وہ آج ہمارے لیے ایک عمدہ مثال ہے-

مفتی صاحب استاذ مطلق کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے پہلے مکتوب میں فرماتے ہیں:

''اجوبۂ سوالات پانزدہ گانہ کہ در رمضان رسیدہ در ماہ شوال بامعان نظر دیدم جملہ جواب ہا نہایت برجستہ وپسندیدہ وبدلائل عقلیہ ونقلیہ بہ نیکوترین بیانہا مدلل ومبرہن است، مگر در بعضے جا بقصور ادراک وفہم خود یک گونہ ترددوارم''-

(ترجمہ: ان پندرہ سوالات کے جوابات رمضان میں پہنچ گئے تھے، ماہ شوال میں غور سے ملاحظہ کیے، جوابات نہایت برجستہ اور پسندیدہ ہیں اور عقلی ونقلی دلائل سے بہترین طریقے پر مزین ہیں، مگر بعض مقامات پر مجھے اپنی فہم ناقص کی وجہ سے تامل ہے)

پھر آپ نے اپنے اس تردد کا ذکر کیا ہے، اس کے جواب میں استاذ مطلق اپنے خط کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''بجناب مولوی صاحب والا مناقب مخدوم ومکرم، مطاع معظم، ملاذ عقیدت کیشاں،......خیر اندیشاں، دامت عنایاتہم بعد تسلیم وتمنائے نیاز گزارش میکرد کہ عنایت نامہ نوازش...... بست وچہارم شوال فیض ورود بخشیدہ منت برجاں گزاشت''-

(ترجمہ: بجناب مولوی صاحب والا مناقب مخدوم ومکرم، مطاع معظم عقیدت مندوں کی جائے پناہ......دامت عنایاتہم، سلام اور تمنائے ملاقات کے بعد عرض ہے کہ عنایت نامہ نے ۲۴ ر شوال کو تشریف لاکر میری جان پر احسان کیا)

خط کا اختتام ان الفاظ میں ہوتا ہے''عریضہ نیاز محمد فضل حق ختم اللہ لہ بالحسنیٰ غرہ ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ''

اس کے بعد استاذ مطلق نے مفتی صاحب کے خط کی ایک نقل سیف اللہ المسلول کے پاس ارسال کردی اور ان سے رائے طلب کی، سیف اللہ المسلول استاذ مطلق کے نام خط کا آغاز ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''جناب افادت مآب افاضت...... مسند الوقت امام العصر رئیس الزماں حجۃ اللہ الاستاذ المطلق مولانا وبالفضل اولانا حضرت مولوی فضل حق دام دوامہم پس از گزارش آنچہ باید وشائد عرض ایں است کہ جواب استفتائیکہ خادمے از خدام بحضور آں قدوۃ الانام گزرانیدہ وملازمان والا آں را پیش گاہ یکے از احباب عالی جناب خود بدولت کہ نام نامی آں جناب گرامی معلوم شد ارسال فرمودند، وتحریر آں تحریر کہ بحضور ملازمان رسیدہ ایں ہیچ مداں را مرحمت کردیدہ، وآں ایں نست''-

(ترجمہ: جناب افادت مآب مسند الوقت امام العصر رئیس الزماں حجۃ اللہ الاستاذ المطلق مولانا وبالفضل اولانا حضرت مولوی فضل حق دام دوامہم عرض یہ ہے کہ اس استفتا کا جواب جو آپ قدوۃ الانام کی بارگاہ میں کسی خادم نے پیش کیا تھا اور آپ نے وہ جواب اپنے احباب عالی جناب میں سے ایک صاحب (مفتی آزردہ) جن کا نام نامی معلوم ہے کو ارسال فرمادیا تھا اور پھر (اس کے جواب میں) ان محترم کی جو تحریر آپ کے پاس آئی وہ آپ نے اس کم علم کو مرحمت فرمادی وہ تحریر یہ تھی......)

پھر مفتی صاحب کے خط سے ایک عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''ایں بے بضاعت فاقد اللیاقت کہ بزیارت آں کتب سعادت گردیدہ ہر چند فقرہ آخریں یعنی ''در ضال ومضل بودن صاحب ایں اقوال شک نیست'' موجب تسکین مجیب وجملہ ناظرین گردیدہ، جزاہ اللہ خیراً فاما تقریر تردد وتامل حضرت تحریر کہ در آں تحریر ست فقیر را ہم.....متردد ومتامل نمودہ آخراً بعد فکر بسیار رفع تردد حقیر شد، بوجوہیکہ

......عرض کردنش بوالا خدمت فیض موہبت وہم بواسطہ ملازمان سامی بجناب حضرت نحریر صاحب تحریر مناسب نمود لا جدلاً حاشا وکلا بل استصلاحاً واستصوابا وکفی باللہ شہیداً‘‘۔

(ترجمہ: یہ بے بضاعت اور بے لیاقت ان کتب کی زیارت سے مشرف ہوا ہے، ہر چند کہ (مفتی صاحب کے خط کا) آخری جملہ کہ ’’ان اقوال کے قائل کے گمراہ وگمراہ گر ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہے‘‘ حضرت مجیب اور جملہ ناظرین کے لیے تسکین کا باعث ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، رہا یہ کہ حضرت علامہ نے جو تردد وتامل ظاہر کیا ہے تو فقیر بھی اس معاملہ میں تردد اور تامل کا شکار تھا، آخر کار غور وفکر کے بعد فقیر کا تردد دور ہوگیا، ان دلائل کی بنیاد پر جو خدمت والا میں عرض کیے تھے اور آپ کے توسط سے حضرت علامہ (مفتی صاحب) کی خدمت میں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، حاشا وکلا جدال کے لیے نہیں بلکہ اصلاح ودرستگی کی طلب میں اور اللہ اس (نیت) پر گواہ ہے)
یہ خط وکتابت ۱۲۶۹ھ کے اواخر میں ہوئی ہے، قیاس یہ کہتا ہے کہ اس خط وکتابت کے بعد مفتی صاحب کا تردد رفع ہوگیا ہوگا، کیوں کہ ہمارے سامنے اس فتوے کی جو مطبوعہ کاپی ہے اس پر دیگر علما کے علاوہ مفتی صاحب کے بھی دستخط ثبت ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ آپس میں علمی تنقیدیں بھی ہو رہی ہیں، ایک دوسرے پر رد بھی کیا جا رہا ہے، اختلاف رائے بھی ہو رہا ہے مگر تحریر کی ایک ایک سطر سے نیاز مندی، عزت واحترام اور ایک دوسرے کی قدر شناسی کا نور پھوٹ رہا ہے، دراصل علمائے ربانیین کا یہی وطیرہ اور یہی شان ہوا کرتی ہے۔ انہیں نعمتوں سے آج ہم محروم ہوگئے، جس کے نتیجے میں خالص علمی اختلاف رائے بھی ذاتی مخالفت کی شکل اختیار کرجاتا ہے، ان تینوں حضرات کے باہم روابط وتعلقات اور مراسم خلوص ومحبت آج ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔□□□

مراجع

(۱) آثار الصنادید: مرتبہ خلیق انجم ج ۲/ص ۸۸، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ۲۰۰۳ء
(۲) حیات سید احمد شہید ص ۳۰۲، بحوالہ باغی ہندوستان: عبدالشاہد خاں شیروانی ص ۱۹۷، المجمع الاسلامی مبارک پور ۱۹۸۵ء
(۳) آثار الصنادید: مرتبہ خلیق انجم ج ۲/ص ۵۵ تا ۷۳، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ۲۰۰۳ء
(۴) مکتوب علامہ فضل حق خیرآبادی بنام مفتی آزردہ مؤرخہ غرہ ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ، محفوظ کتب خانہ قادری بدایوں
(۵) یادگار غالب: حالی، ص ۲۰۱
(۶) آب حیات: ص ۵۱۲، بحوالہ باغی ہندوستان: عبدالشاہد خاں شیروانی ص ۱۵۸، المجمع الاسلامی مبارک پور ۱۹۸۵ء
(۷) مولود منظوم مع انتخاب نعت ومناقب: مولانا فضل رسول بدایونی، مرتبہ اسید الحق قادری، ص ۵، تاج الفحول اکیڈمی بدایوں ۲۰۰۹ء
(۸) مضمون ’’علمائے خیرآباد وبدایوں کے روابط‘‘ مشمولہ تاج الفحول نمبر ماہنامہ مظہر حق بدایوں ج ۱/ شمارہ ۸، ص ۴۳۱، مطبوعہ ۱۹۹۹ء
(۹) باغی ہندوستان: عبدالشاہد خاں شیروانی ص ۲۳۶، المجمع الاسلامی مبارک پور ۱۹۸۵ء
(۱۰) احوال ومقامات: عبدالہادی قادری، ص ۸۰، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۹۲ء
(۱۱) مضمون ’’علمائے خیرآباد وبدایوں کے روابط‘‘ مشمولہ تاج الفحول نمبر ماہنامہ مظہر حق بدایوں ج ۱/ شمارہ ۸، ص ۴۳۰، مطبوعہ ۱۹۹۹ء
(۱۲) اکمل التاریخ: ج ۱/ ص ۸۹، مطبع قادری بدایوں ۱۳۳۳ھ
(۱۳) سیف الجبار ص ۴۸، مطبع صبح صادق سیتاپور ۱۲۹۲ھ
(۱۴) فوز المؤمنین بشفاعۃ الشافعین ص ۳۰، مطبع مفید الخلائق دہلی ۱۲۶۸ھ
(۱۵) المعتقد المنتقد ص ۱۱۲، مطبع اہل سنت پٹنہ ۱۳۲۱ھ
(۱۶) مرجع سابق: ص ۳ (۱۷) مرجع سابق: ص ۴ (۱۸) مرجع سابق: ص ۴/ ۵
(۱۹) منتہی المقال: ص ۴۱/ ۴۲، شرف المطابع دہلی ۱۲۶۸ھ
(۲۰) یہ کتاب میں نے قاہرہ میں ایک پاکستانی دوست کے پاس دیکھی تھی، فی الحال نہ کتاب سامنے ہے اور نہ ہی مصنف کا نام یاد آ رہا ہے
(۲۱) ابجد العلوم: بحوالہ نزھۃ الخواطر: از سید عبدالحی لکھنوی، ج ۷/ ص ۴۱۳، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۹۲ء
(۲۲) فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون: حکیم محمود احمد برکاتی، ص ۱۰۸/ ۱۰۹، برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۸۷ء
(۲۳) نواب صدیق حسن خاں: از ڈاکٹر رضیہ حامد، ص ۷۵/ ۷۶، باب العلم پبلی کیشنز دہلی طبع دوم ۱۹۹۸ء
(۲۴) المعتقد المنتقد ص ۴، مطبع اہل سنت پٹنہ ۱۳۲۱ھ (۲۵) مرجع سابق
(۲۶) احوال ومقامات: عبدالہادی قادری، ص ۹۹/ ۱۰۰، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۹۲ء

نورین علی حق ☆

9/11 کے بعد دنیا کا سب بڑا ڈرامہ

وکی لیکس کی کہانی مسلم امہ کے خلاف ایک سازش تھی جسے مسلم بصیرت نے ناکام بنادیا

پردہ اٹھتا ہے: وکی لیکس کے ذریعہ جاری کیے گئے ڈھائی لاکھ خفیہ دستاویزات میڈیا میں موضوع بحث بنے ہوئے ہیں، اور طرح طرح کی پیشین گوئیوں کا بازار گرم ہے۔ ان خفیہ دستاویزات کے اجراء سے یہ بات پایۂ ثبوت تک تو پہنچ ہی گئی ہے کہ دیگر ممالک کے سربراہ یا حکام جنون اور مرگی میں مبتلا ہوں کہ نہ ہوں، امریکہ اور اس کے حکام طاقت کے نشہ میں جنون کی حد سے تجاوز کر چکے ہیں۔ ان دستاویزات کے منظر عام پر آنے سے امریکی اخلاق باختگی بھی عیاں ہو چکی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں ایک دوسرے کے سفرا موجود ہوتے ہیں اور اپنی ذمہ داری انجام دیتے ہیں، اپنے ملکی مفادات کا حصول اور اس کا تحفظ ونگرانی ان کی حد ہوتی ہے، وہ حتی الامکان یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنی حد سے تجاوز نہ کریں الا یہ کہ خود اس ملک کی حکومت کوئی خصوصی ذمہ داری انہیں سونپ دے، خصوصی ذمہ داری افہام وتفہیم وغیرہ کی ہوتی ہے جسے وہ اپنے منہج پر ادا کرتے ہیں اور غیر ضروری تنازعات سے خود کو بچاتے بھی ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ دیگر ممالک میں اپنے سفراء سے جاسوسی بھی کراتا ہے یہاں تک کہ اقوام متحدہ میں متعین ہندوستان، چین، پاکستان، کیوبا، وغیرہ کے نمائندوں کی ذاتی زندگیوں پر بھی گہری نظر رکھنے پر زور ڈالتا ہے۔ ان احکامات پر نہ صرف ہم حیرت واستعجاب کا اظہار کر رہے ہیں بلکہ خود امریکہ کے افغانستان، الجیریا، اور بحرین میں سابق امریکی سفیر رونلڈ ری مین نے بھی ان پر حیرت کا اظہار کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ واشنگٹن ان سے دیگر ملکوں کے بارے میں مسلسل وسیع پیمانے پر معلومات بھیجنے کا تقاضا کرتا ہے، حالاں کہ یہ ناقابل فہم ہے کہ مختلف شخصیات کے کریڈٹ کارڈز کے نمبر وغیرہ جمع کرنے کا مطالبہ فارن سروس کے افسران سے کیوں کیا جارہا ہے جن کے پاس کسی طرح کی خفیہ معلومات جمع کرنے کی تربیت نہیں ہے۔

اسی طرح مارچ 2008 میں لکھے گئے ایک اور خط میں پیراگوئے میں تعینات ایک سفارت کار سے پیراگوئے، برازیل اور ارجنٹائن کے سرحدی علاقے میں القاعدہ، حزب اللہ اور حماس کی موجودگی کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا تھا۔ ان دستاویزات میں کئی ممالک کے سربراہوں کا مضحکہ بھی اڑایا گیا ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ خفیہ دستاویزات کے شائع ہو جانے اور امریکہ کے رازہائے سربستہ کے عیاں ہو جانے کے باوجود کسی بھی امریکی کا معذرت نامہ اب تک سامنے نہیں آسکا ہے بلکہ اس پر وکی لیکس اور خفیہ دستاویزات کا انکشاف کرنے والوں کو دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے کہا ہے کہ دستاویزات عیاں کرنے والوں اور اس کا سبب بننے والوں کے خلاف سخت اور جارحانہ اقدامات کیے جائیں گے۔ دوسری طرف اپنے غیر اخلاقی بیانات اور احکامات کی زہر آلودگی کو کم کرنے کے لیے وہ یہ بھی کہنے سے نہیں کترا رہی ہیں کہ امریکہ سمیت ہر ملک کو لازمی طور پر اس قابل ہونا چاہیے کہ جن قوموں اور لوگوں کے ساتھ وہ کام کرتے ہیں ان کے بارے میں بے تکلف گفتگو کر سکیں اور امریکہ سمیت ہر ملک کو لازمی طور پر اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے ممالک کے ساتھ مشترکہ تحفظات پر ایمان داری کے ساتھ نجی بات چیت کر سکے۔ حالاں کہ اخلاقی طور پر انہیں ان ممالک سے معافی مانگنی چاہیے تھی جن کے بارے میں بھونڈے اور بھدے قسم کے جملوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ سب تماشا صرف دولت اور طاقت کا ہے جس کی بنا پر دیگر ممالک بھی ان خفیہ دستاویزات کے سامنے آنے پر شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا لینا چاہتے ہیں کہ وہ تیکھے، تلخ اور امریکہ مخالف بیانات دے کر جنگ وجدال مول خرید لینا نہیں چاہتے۔ غیر مسلم ممالک میں تو یہ ہمت ہی نہیں کہ وہ ان دستاویزات کو سچ اور مبنی بر حقیقت تسلیم کر لیں اس لیے پاکستان نے سعودی فرماں روا شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز سے منسوب صدر پاکستان زرداری سے متعلق بیان کو مسترد کر دیا ہے۔

واضح رہے کہ ان خفیہ دستاویزات کی جتنی تفصیل اب تک سامنے آسکی ہے اس میں سب سے زیادہ مسلم ممالک اور سربراہان کا کچا چٹھا ہے یہاں تک کہ فرانسیسی میڈیا نے کہا ہے کہ:

"ان رپورٹس کی روشنی میں بعض ممالک اور حکمرانوں کے متعلق

☆alihaqnm@yahoo.com

عالمی سوچ بدل سکتی ہے تاہم اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلم ممالک کو ہوگا-ان کے درمیان نفرت اور اختلافات کھل کر سامنے آنے کے امکانات بڑھ جائیں گے اور ان ممالک کے عوام میں پہلے سے موجود دوسرے ممالک کے حکمرانوں کے خلاف جذبات اور رخدشات کو ہوا ملے گی-یہ ایک تلخ سچائی ہے کہ ان دستاویزات کے افشا کرنے کا اصل مقصد مسلم ممالک کے مابین دوریاں بڑھانا ہے-چوں کہ ان دنوں ایران سے سعودی عرب کے تعلقات میں پہلے سے بہتری اور استحکام نظر آرہا ہے اور کبھی بھی مغربی ممالک مسلم دنیا کے اتفاق پر چین وسکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتے-اس لیے یہ ایک طریقہ نکالا گیا ہے تاکہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے-وہ حقائق جنہیں اسلامی ممالک کے سربراہوں کے متعلق وکی لیکس نے جاری کیے ہیں انہیں اگر کوئی امریکی وزیر یا حاکم کہتا تو سعودی اور متحدہ عرب ممالک کے تعلقات امریکہ سے تلخ ہوجاتے یا کم از کم وہ راز جسے شکوک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے وہ کھل جاتا کہ امریکہ مسلم دنیا کے آپسی بہتر تعلقات کو پسند نہیں کرتا-اس لیے یہ کام وکی لیکس کے ذریعہ کرایا گیا-سوال یہ اٹھتا ہے کہ جس ملک کے پرندے دوسرے کسی ملک میں ماردیے جاتے ہیں یا شکار کرلیے جاتے ہیں تو اسے خبر ہوجاتی ہے اور لاکھوں خفیہ دستاویزات چوری کرلیے جاتے ہیں تو اسے اس کی بھنک تک نہیں لگتی-یہ بات ناقابل فہم ویقین ہے-دراصل یہ 9/11 کے بعد کا سب سے بڑا ڈرامہ ہے جسے خود امریکہ نے رچا ہے اور مہرہ وکی لیکس کو بنایا گیا ہے، تاکہ ایک ابھرتی ہوئی مسلم طاقت کو مسلم ممالک کے ذریعے ہی کچل دیا جائے یا عبداللہ بن عبدالعزیز کے اصرار (امریکہ ایران پر حملہ کردے) پر ایران پائجامہ سے باہر آکر سعودی اور متحدہ عرب امارات کو دھمکی دے دے تو ہم دیگر مسلم ممالک کی خوشنودی کے حصول کے بعد ایران کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادیں، حالاں کہ ان ممکنہ اور متوقع امکانات کے پیش نظر ایرانی صدر احمدی نژاد نے بروقت اور عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ کہہ کر چور کے منہ پر کالک پوتنے کا عمل کیا ہے کہ ان دستاویزات سے ایران کے اپنے ہم سایہ عرب ممالک کے ساتھ تعلقات متاثر نہیں ہوں گے-ان خفیہ دستاویزات کو افشا کرنے والے وکی لیکس کے مقاصد کو جاننے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ وکی لیکس کیا ہے:

وکی لیکس (Wiki leaks) ایک تعارف؟ وکی لیکس کا کہنا ہے کہ وہ ایک بین الاقوامی بے لوث میڈیا آرگنائزیشن ہے-وہ خفیہ سینسرڈ، سیاسی، سفارتی اور اخلاقی اہمیت کے متعلق ممنوعہ اور غیر مطبوعہ دستاویزات بھی غیر معروف اور گمنام شخص سے قبول کرکے اسے منظر عام پر لاتی ہے-سویڈن میں اس ویب سائٹ کا قیام 2006ء میں عمل میں آیا-اسے سن شائن تنظیم چلاتی ہے-اس نے اپنی لاؤنچنگ کے ایک سال کے اندر ہی 1.2 ملین خفیہ دستاویزات اکٹھا کرنے کا دعویٰ کیا-خفیہ طور پر اس کے بانیوں میں چین، متحدہ عرب امارات، تائیوان، یوروپ، آسٹریلیا، اور جنوبی افریقہ کے ٹکنالوجی کے ماہرین اور صحافی شامل ہیں اور وہی اس کا مالی تعاون بھی کرتے ہیں-صرف ایک آسٹریلین شخص Julain Assange ڈائرکٹر کے طور پر بظاہر نظر آتا ہے-جولین اسانزے ۱۹۷۱ء میں آسٹریلیا کے شہر کوئنس لینڈ میں پیدا ہوا جہاں اس کے والدین اپنی تھیٹر کمپنی چلاتے تھے لیکن اسانزے کو نوجوانی سے ہی کمپیوٹر کا جنون تھا اس پر 1995ء میں درجنوں ویب سائٹس ہیک کرنے کا الزام بھی لگ چکا ہے، جس کے بعد اسے عدالت میں اعتراف اور جرمانہ ادا کرنا پڑا-39 سالہ اسانزے کہیں مستقل قیام پذیر نہیں رہتا-عام طور پر اس کے پاس دو کیری بیگ رہتے ہیں جن میں سے ایک وہ اپنے کپڑے اور دوسرے کو لیپ ٹاپ کے لیے استعمال کرتا ہے-اسانزے 1980ء کی دہائی کے آخر میں ہیکنگ کرنے والے گروپ "انٹرنیشنل سرویز" کا رکن بھی تھا، اس دوران 1991ء میں میل برن میں واقع اسانزے کے گھر پر آسٹریلیائی پولس نے چھاپہ بھی مارا-1996ء میں اسانزے نے کمپیوٹر پروگرامر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا-اس کے بعد اس نے 1999ء میں لیکس ڈاٹ او آرجی نامی ڈومین رجسٹرڈ کرایا-

وکی لیکس کو مختلف ایوارڈز سے بھی نوازا جا چکا ہے جن میں 2008ء کا اکونومسٹ میگزین نیو میڈیا ایوارڈ، 2009ء میں ایمنیسٹی انٹرنیشنل کا یوکے میڈیا ایوارڈ، قابل ذکر ہیں-موخر الذکر ایوارڈ ویب سائٹ کے علاوہ اس کے بانی جولین اسانزے کو بھی دیا گیا-مئی 2010ء میں دی نیویارک ڈیلی نیوز نے اسے خبروں کو مکمل طور پر تبدیل کرسکنے والی ویب سائٹس میں سرفہرست رکھا-

دسمبر 2006ء میں وکی لیکس کے پہلے ڈاکومینٹ پوسٹ میں

صومالیا کے سرکاری افسر کے قتل کے فیصلہ پر شیخ حسن داہری کے دست خط شدہ دستاویز عام کیے گیے۔ جنوری 2007ء میں پہلی مرتبہ یہ ویب سائٹ انٹرنیٹ پر جاری ہوئی۔ ان ہی ایام میں امریکی فوج کی خفیہ اطلاعات پہنچانے والے محکمہ میں متعین براڈلے میننگ نامی سپاہی نے امریکی فوج سے اپنی برگشتگی کے بعد وکی لیکس کو عراق میں موجود امریکی فوجیوں کی خفیہ اطلاعات غیر معمولی تعداد میں بہم پہنچائی۔ اسے خفیہ اطلاعات اپنے کمپیوٹر پر منتقل کرنے کی پاداش میں گرفتار بھی کرلیا گیا۔ اب بھی اس سلسلہ میں اس پر مقدمہ چل رہا ہے، پر لطف بات یہ ہے کہ مذکورہ فوجی سپاہی براڈلے میننگ Bradley Meaning امریکی ہے۔ اپریل 2010ء میں اس نے 2007ء کا ایک ویڈیو جاری کیا جس میں امریکی اور اس کے اتحادی فوجیوں کی داستان ظلم وجبر قید تھی۔ اسی سال جولائی 2010ء میں 76,900 خفیہ دستاویزات پر مبنی افغان جنگ ڈائری جاری کرکے پوری دنیا میں ہلچل مچادی، 2008ء میں امریکی انتخابات کے دوران اس نے ایک میل بکس کے خاکے جاری کیے تھے جن میں اس وقت کی نائب صدر کی امیدوار سارہ پالن کی تصاویر اور اڈریس بک کے متعلق معلومات تھیں۔

جنوری 2009ء میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کے 600 دستاویزات عام کیے گیے، اسی سال ایسٹ انجلیا یونیورسٹی کی کلائی میٹ ریسرچ یونٹ کے متنازعہ دستاویزات کو چھاپ دیا۔ جن میں ماہرین موسمیات کے مابین ای میل کے ذریعہ باتیں ہوئی تھیں۔ 19 مارچ 2009ء کو مختلف ممالک کی غیر قانونی سائٹس کی فہرست جاری کی گئی 28 جنوری 2009ء کو پیرو کے قومی لیڈروں اور تاجروں کے درمیان 86 ٹیلی فونک ریکارڈنگ جاری کی اس میں پیٹروگیٹ آئل اسکینڈل سے متعلق باتیں تھیں یہ اسکینڈل 2008ء میں ہوا تھا۔ 16 جنوری 2009ء کو ایرانی نیوز ایجنسی نے رپورٹ دی کہ ایران کے ایٹمک ایجنسی آرگنائزیشن کے سربراہ نے اپنی 12 سالہ خدمات کے بعد اچانک استعفا دے دیا، بعد میں وکی لیکس نے ایک رپورٹ جاری کی جس میں بتایا گیا کہ ایران میں زبردست ایٹمی دھماکہ ہوا تھا، 25 نومبر 2009ء کو اس نے 5.70 لاکھ پیجر پیغامات عام کیے۔ یہ پیغامات 9/11 کے دن پنٹاگن افسروں اور نیویارک سٹی کے محکمہ پولس کے درمیان بھیجے گیے تھے۔ 15 مارچ 2010ء کو امریکی محکمۂ دفاع کی 32 صفحات پر مشتمل خفیہ رپورٹ جاری کی گئی اس میں 2008ء کی کاؤنٹر انٹیلی جنس انالائسیس رپورٹ تھی۔ سب سے بڑا دھماکہ اس نے اس مرتبہ امریکہ کے لاکھوں خفیہ دستاویزات جاری کرکے کیا ہے جنہیں ہضم کرجانا پوری دنیا کے لیے باعث پریشانی ثابت ہورہا ہے۔

موجود دستاویزات پر ایک طائرانہ نظر:- 2,51,287 خفیہ اطلاعات ودستاویزات 30 نومبر کو وکی لیکس نے جاری کیے، جو گالیوں اور دشنام طرازیوں کا پلندہ ہے۔ غور طلب مقام ہے کہ ان دستاویزات میں کسی بھی ملک کے سربراہ کو اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا گیا ہے۔ عام طور پر غلط تاثر ہی دیگر ممالک کے سلسلہ میں امریکہ کا ہے جس سے خود امریکہ کی شرافت اور نمائشی تعلقات کا راز فاش ہوگیا ہے۔ ایسے ایسے ریمارکس ہیں جن کا تصور ایک شریف آدمی کر ہی نہیں سکتا چہ جائے کہ کوئی ملک کسی دوسرے ملک کے سربراہ کے سلسلہ میں ایسا کرے۔ ان حقائق کے منکشف ہونے سے انسانیت مجروح ہوئی ہے۔ گرچہ ان کا مقصد مسلم ممالک کے مابین منافرت پھیلانا رہا ہو مگر اس زمرے میں امریکہ بھی ننگا ہوگیا ہے۔ ان میں ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کو ہٹلر سے یاد کیا گیا ہے، فرانس کے صدر سرکوزی کو بے لباس بادشاہ بتایا گیا ہے۔ جرمنی کی چانسلر انجلینا مرکل کو کمزور حکمراں، افغانی صدر حامد کرزئی کو دماغی خلل کا شکار اور لیبیا کے صدر کرنل معمر قذافی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی کل وقتی نرس ایک گرم حسینہ ہے۔ اس طرح کے افکار بہر حال غیر ذمہ دار اور غیر مہذب ہی لوگوں کے ہوسکتے ہیں۔ خصوصی طور پر ان دستاویزات میں شاہ عبداللہ بن عبد العزیز کے حوالہ سے دو مسلم ملک کے سلسلہ میں بات سامنے آئی ہے۔ ایک تو یہ کہ پاکستانی صدر آصف علی زرداری دہشت گردی کے سدباب میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ دوسری یہ کہ سعودی فرماں روا نے ایک سے زائد بار امریکہ سے اصرار کیا کہ آپ ایران پر حملہ کرکے اس کے نیوکلیائی تنصیبات کو تباہ وبرباد کردیں وہیں عادل الزبیر کے حوالہ سے بھی یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ کہا کہ سعودی فرماں روا چاہتے ہیں کہ آپ لوگ سانپ کا سر کچل دیں۔ گرچہ ان دستاویزات کے سامنے آنے کے بعد سعودی وزارت خارجہ نے ان باتوں کی سخت انداز میں تردید کردی ہے وہیں صدر ایران محمود احمدی نژاد نے بھی کہا ہے کہ عرب

ممالک مغرب اور امریکہ کے جھانسے میں نہ آئیں ان کا اصل مقصد ہمارے باہمی تعلقات خراب کرنا ہے۔ ہمارے تعلقات پر وکی لیکس کا جادو اثرانداز نہیں ہوگا۔

وکی لیکس کے پاس ان اقوال کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلائل نہیں ہیں اس لیے اس پر کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ ایران وعرب کے بعض اختلافات کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے، تاکہ شیعوں کی اکثریت سعودی شاہ سے کم از کم متنفر ضرور ہوجائے اور احمدی نژاد کے بیان کے بعد بھی بہت حد تک اس کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

ان امکانات کو مسلم ذہن سے کھرچ پھینکنے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ اگر یقیناً وکی لیکس کے یہ انکشافات جھوٹ ہیں تو سعودی اس پر سخت اقدامات کرے اور اس کی گہرائی تک جائے کہ یہ وکی لیکس کی شرانگیزی ہے یا امریکی حکام کی کہ انہوں نے ہی ان اقوال کو سعودی شاہ سے منسوب کردیا۔ ورنہ مغرب اور اس کے ادارے اسی طرح جھوٹ منسوب کرکے ایک نہ ایک دن اپنے مقاصد واہداف میں ضرور کامیاب ہوجائیں گے۔ ایران کب تک برداشت کرسکے گا۔ اور یہ بھی امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ ایران کے تباہ ہوجانے کے بعد 56 مسلم ممالک میں سے کسی کے پاس یہ دم خم نہیں ہے کہ وہ امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکے۔ آج حالات اس قدر عبرت ناک ہیں جس کا تصور ممکن نہیں۔ ہمارے کئی مسلم ممالک کے پاس دولت وثروت اور تیل کی زبردست فراوانی ہے۔ لیکن وہ پھر بھی امریکہ اور دیگر یوروپی ممالک کے دست نگر ہیں۔ حالاں کہ یوروپ اور امریکہ عرب ممالک سے تیل اور دولت حاصل کرتے ہیں اور ان ہی پر رعب بھی جھاڑتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مضحکہ خیز ہوسکتا ہے کہ سعودی فرماں روا شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز کو آپریشن کرانا ہوتا ہے تو وہ امریکہ کا سفر کرتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ عرب میں تشفی بخش ذرائع علاج مہیا نہیں ہیں یا خود اپنے ملک کے ذرائع علاج سے شاہ عبداللہ مطمئن نہیں ہیں اس لیے وہ امریکہ کا سفر کرتے ہیں۔ بہرحال ان ہی ایام میں جب وکی لیکس کا ڈرامہ رونما ہوا شاہ سعودی کا امریکہ میں ہونا مصلحت سے خالی نہیں محسوس ہوتا۔ اب تک ان حقائق کا خلاصہ سامنے نہیں آسکا ہے اور نہ ہی آنے کی امید ہے چوں کہ 9/11 ڈرامہ کے حقائق دس سال گزر جانے کے باوجود سامنے نہیں آسکے تو حالیہ ڈراموں کا سامنے آنا بھی آسان نہیں ہے۔

بہت سے ذہنوں میں یہ سوال بھی اٹھ رہا ہوگا کہ آخر کوئی ملک اپنے خلاف بھی سازش کیوں کرسکتا ہے تو اسے سمجھنے کے لئے 9/11 پر قائم کیے جانے والے شکوک کا مطالعہ ضروری ہے، ان کے مطالعہ سے سوچنے کا انداز بدلتا ہے اور قاری یہ سمجھ پاتا ہے کہ یہودی ومسیحی لابیز مسلمانوں کو بدنام کرنے اور انہیں پوری طرح مغرب زدہ ان کے ذہن پر آتا ہے کہ کوئی اسلامی ملک خودکفیل بننے کی کوشش کررہا ہے تو وہ اس کے خلاف نت نئی سازشیں رچتے ہیں، اپنی دھونس جمانے اور دوسروں کو کمزور وکمتر ثابت کرنے کے لیے مختلف اسلحے استعمال کرتے ہیں۔ پورا مغرب کلیسا کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے اور جب کوئی مسلم سربراہ قرآن ورسول ﷺ کا اتباع کرتا ہے تو اس کا عمل مغرب کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے، مغرب کی یہ دوہری پالیسی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے تبلیغی مشن کا ایک حصہ ہے۔ جسے وہ بڑے ہی شاطرانہ انداز میں سیکولر خول کے اندر لپیٹ کر مشرق کی طرف اچھال دیتا ہے اور خول کو ہی دیکھ کر مشرقی اس کے دلدادہ ہوجاتے ہیں۔ بہرکیف اس سے قبل بھی امریکی ڈرامہ پر تجزیہ نگاروں نے بے تحاشا شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے جو دنیا کی مختلف زبانوں کی کتابوں اور رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے ہیں البتہ 9/11 پر مبنی شکوک وشبہات کو کافی حد تک نذرالحفیظ ندوی نے اردو میں اپنی تصنیف مغربی میڈیا اور اس کے اثرات کے نئے ایڈیشن میں سمیٹا ہے۔

اس چوطرفہ بے چینی کے باوجود امریکہ کی خاموشی اور مسلم ممالک پر پیہم حملے شکوک وشبہات کو مزید ہوا دیتے ہیں۔ البتہ مسلم دنیا حقائق جاننے کی خواہاں ضرور ہے۔ بہرحال ڈھائی لاکھ سے زائد خفیہ اطلاعات میں 2,278 کاٹھمنڈو کے امریکی سفارت خانہ سے اور 3325 کولمبو کے امریکی سفارت خانہ سے، 2220 اسلام آباد کے امریکی سفارت خانہ سے اور 3038 پیغامات ہندوستان کے امریکی سفارت خانہ سے جاری کیے گئے ہیں۔ ان خفیہ دستاویزات کو بعض 2006ء سے مارچ 2010ء تک کے بتاتے ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ ان کی مدت 28 دسمبر 1966ء سے شروع ہوتی ہے اور یہ دستاویزات 28 فروری 2010ء تک کو محیط ہیں۔

وکی لیکس ڈرامہ کے حقائق و مقاصد کیا ہیں؟ دقت نظر سے دیکھے جانے کے بعد کوئی بھی باشعور انسان یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان دستاویزات کا بیشتر حصہ ایسا ہے جسے پروپیگنڈے کے بغیر بھی عام کیا جاسکتا تھا لیکن اس کام کے لیے پوری دنیا کے میڈیا کا میدان میں آنا اور اس پر واویلا مچانا کسی خاص مقصد کے لیے ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ یوروپ وامریکہ کا یہ پرانا وتیرہ رہا ہے کہ وہ دوسروں کو لڑاتے ہیں اور حکومت کرتے رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ افغانستان وعراق کی تباہی کو بھی عرصہ گزر چکا ہے۔ 56 مسلم ممالک میں صرف ایک ایران ہی باقی ہے جو امریکہ کے کنٹرول سے باہر اور اس کے چشم وابرو کے اشاروں پر رقص کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اسی لیے یہ ڈرامہ رچا گیا تاکہ تمام مسلم دنیا میں شیعہ سنی آپس میں ہی باہم دست وگریباں ہوجائیں اور ایران قوت برداشت کھو کر سعودی کو دھمکی بھی دے دے تو عرب ممالک کے موٹے دماغ والوں کی اجازت سے ایران پر حملہ کرنا آسان ہوجائے گا اس طرح اپنا مقصد بھی حل ہوجائے گا اور اگر ایران کی تباہی کے بعد وہاں بھی عراق کی طرح انسانیت سوز اور تباہی پھیلانے والے ایٹمی ہتھیار دریافت نہ ہوسکے تو بعد میں ہمیں سبکی کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑے گا اور اس طرح وہ بش سے بہتر صدر امریکہ بھی ثابت ہوجائیں گے چوں کہ بش کو عراق پر دلائل کے بغیر حملہ کرکے بعد میں پوری دنیا کی طرف سے تنقید اور مذمت برداشت کرنا پڑی تھی۔ اور اس طرح مسلمانوں کو بھی خانوں میں تقسیم کرنا آسان ہوجائے گا۔ یہ تو دونوں رہنماؤں سعودی فرماں روا شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز اور بالخصوص محمود احمدی نژاد کی دوراندیشی کا نتیجہ ہے کہ مسلم دنیا میں شیعہ۔ سنی منافرت نہیں پھیل سکی۔ اگر محمود احمدی نژاد اس پر خاموشی اختیار کرلیتے یا اس پر سخت ردعمل کا اظہار کرتے تو عین قریب محرم کے مہینہ میں شیعہ سنی اختلافات پھوٹ پڑتے اور انہیں جانی ومالی خسارے برداشت کرنے پڑتے۔ میرے اس خیال کو امریکہ کی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے اس بیان سے تقویت ملتی ہے کہ وہ ایک طرف وکی لیکس کے خلاف سخت اقدامات کی دھمکیاں دے رہی ہیں تو وہیں اس بات کی تصدیق بھی کررہی ہیں کہ ایران کے ہم سایہ عرب ممالک اس کے نیوکلیائی ایٹمی تنصیبات سے حددرجہ پریشان ہیں۔ یعنی وہ پس پردہ اس بات کی تصدیق کررہی ہیں کہ یقیناً شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے ایران پر حملہ کے لیے امریکہ سے اصرار کیا تھا اور عادل الزبیر سفیر امریکہ برائے سعودیہ کی طرف بھی جو قول منسوب ہے وہ بھی سچ ہے۔ منظر عام پر آنے والے دستاویزات کے سیاق وسباق بہرحال اس جانب اشارہ کرتے ہیں، ورنہ ایسے موقع پر جب مسلم دنیا خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ رہی ہو اس طرح کے بیانات آگ پر گھی کا کام کرتے ہیں۔ اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ عبداللہ بن عبدالعزیز کو امریکہ نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس طرح کے بیان پر اکسایا ہو اور بعد میں اسے منظر عام پر بھی لادیا گیا۔ جس وقت شاہ عبداللہ بنفس نفیس امریکہ میں موجود تھے اور ان کے لیے پوری عمارت ہی مخصوص کرلی گئی تھی تاکہ غیر ضروری لوگوں کو یہ بھی پتہ نہ چل سکے کہ وہاں کیا ہورہا ہے اور بآسانی بیانات جاری کرائے جاسکیں۔ جولین اسانژے بھی لاپتہ ہوچکے ہیں یہ بھی ایک معمہ ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، کیا پتہ وہ خود کہیں فرار ہوا یا اسے انڈر گراؤنڈ کرادیا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ میری اس تشویش پر بہت سے اذہان میں یہ سوال اٹھے کہ اس سے پہلے بھی امریکہ کے مظالم کو وکی لیکس سامنے لاچکا ہے پھر امریکہ اپنے مقاصد کے لیے اسے کیوں کر استعمال کرسکتا ہے تو اس سوال کا جواب بہت آسان ہے اور ہمارے گردوپیش میں ایسے حالات رونما ہوتے رہتے ہیں جب ایک نیتا دوسری پارٹی کے لیے سخت دست کہتا رہتا ہے لیکن آئندہ الیکشن میں وہ اپنے ذریعہ مخالفت کی جانے والی پارٹی کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکا ہوتا ہے۔ آج کی تاریخ میں ضمیر فروشی کی کوئی حد نہیں ہوتی انسان کسی بھی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ بالخصوص اس وقت اسے اور بھی سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے جب وہ خود کو بے سہارا اور مالی واقتصادی طور پر کمزور محسوس کرتا ہے۔ یہ بات بھی کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ وکی لیکس بند بھی کیا جاچکا ہے اور اس کے ایڈوائزری بورڈ کے ممبر کے طور پر صرف اسانژے ہی سامنے آئے ہیں۔ اس لیے یہ سوچنے کی بھی گنجائش اپنی جگہ باقی ہے کہ اندرونی طور پر خود امریکہ ہی اسے مالی تعاون کرتا ہو۔ پھر میڈیا کے حواس پر اس طرح اس کا چھا جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہودی ومسیحی لابی کا دست مقدس اس کی پشت پر ہے، ورنہ یہ دستاویزات اس طرح ہر فرد بشر کا موضوع سخن نہیں بن پاتے۔ بہرحال قابل تعریف ہیں محمود احمدی نژاد کہ ان کے محض ایک تردیدی بیان سے مسلمانوں کا خون آپسی قتال سے محفوظ رہا اور امریکہ، اسرائیل اور دیگر

یورپی ممالک کے خوابوں کا محل بھی ایک لمحہ میں زمیں بوس ہوگیا اور مظلوم فلسطین کے حق میں آواز اٹھانے والا ایران بھی محفوظ رہا- جب مسلم دنیا کو آپس میں لڑا کر لطف اٹھانے والا مغرب کے ترکش کا آخری تیر بھی ہدف تک نہیں پہنچ سکا تو وہ بوکھلا کر ایران کو دھمکیاں دینے لگے کہ ایران محاذ آرائی اور عدم تعاون کا راستہ لازمی طور پر چھوڑ دے دھمکی آمیز اس جملہ کے بعد کیا کہا جاسکتا ہے وہ ہر شخص جانتا اور اچھی طرح سمجھتا بھی ہے- 30 نومبر کے عین چار دن بعد 4 دسمبر کو یہ بیان عام کیا جانا اس جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ ڈرامہ فلاپ ہونے کے بعد پورا مغرب بوکھلا گیا ہے- 4 دسمبر کو راشٹریہ سہارا نے ویانا (رائٹر) کے حوالہ سے ایک خبر شائع کیا ہے، جس میں یہ بھی ہے کہ ''مغرب کو شبہ ہے کہ ایران نیوکلیائی ہتھیار بنانے کا ارادہ رکھتا ہے- جرمنی، فرانس اور برطانیہ نے نیوکلیائی توانائی ایجنسی کی بورڈ میٹنگ میں ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ اب کوئی متبادل راستہ نہیں رہ گیا- ایران کو لازماً سرگرم طریقہ سے اپنے نیوکلیائی پروگرام کی قطعی پرامن نوعیت کے تعلق سے مغرب کو اعتماد میں لینا ہوگا'' ظاہر ہے کہ تمام متبادل کا استعمال مغرب کرچکا ہے پھر بھی ایران تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہوسکی تو اب زور زبردستی سے کام لیا جائے گا-

مسلم دنیا کے مثبت ردعمل کی ضرورت ہے: مسلم دنیا کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوچنے سمجھنے اور مثبت عمل کے لیے یہ موقع غنیمت کے طور پر دیا گیا ہے اسے وہ محسوس کریں کہ داخلی وجزوی اختلافات چاہے جس حد تک بھی ہوں بہر حال ایک مسلمان ہی دوسرے مسلمان کا ساتھ دے گا- ایسے موقع پر جب کہ خادم الحرمین ہر مسلم نگاہ سے گر جاتے نژاد کے ایک تردیدی بیان نے یہ ثابت کردیا ہے- اب مسلمانوں کو مزید بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا، وہیں دوسری طرف ''الکفر ملة واحدة'' کی حقیقت بھی سامنے آچکی ہے اس لیے وکی لیکس کے اس عمل کے اصل مقصد کو سمجھتے ہوئے آپسی اختلافات کو طاق نسیاں بنا کر مسلم ممالک ''جسد واحد'' کی عملی تفسیر پیش کریں اور ایران کو دوسرا عراق بننے سے بچائیں کہ اس کی تباہی بالواسطہ طور پر ساری مسلم دنیا کی تباہی ٹھہرے گی- اگر ایران تباہ وبرباد ہوگیا تو ساری مسلم دنیا کی حالت 1947ء سے پہلے کے ہندوستان کی سی ہوجائے گی اور مسلم دنیا کی نہ صرف دولت بٹوری جائے گی بلکہ انہیں اچھوت اور غیر مہذب بھی ثابت کیا جائے گا- اور عرب ومتحدہ عرب امارات ''تک تک دیدم دم نہ کشیدم'' کے علاوہ کچھ نہیں کرسکیں گے- چوں کہ ان کے پاس نہ فوج ہے نہ اسلحہ، پھر وہ اپنا سونا اور اپنا تیل بھی حاصل کرنے کے لیے امریکہ ویوروپ کی طرف بھوکے بھکاری کی طرح دیکھنے پر مجبور ہوجائیں گے- اور انہیں امریکہ کا ایک کتا بھی ڈرانے دھمکانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہوگا- اس لیے نہ صرف ایران کا ساتھ زبانی طور پر دیں بلکہ اسے مالی تعاون بھی کریں تاکہ وہ اپنے عزائم وارادے کو بہتر طریقے پر زمین پر اتار سکے- اور زیادہ سے زیادہ نیوکلیائی تنصیبات کا تجربہ کرے-

سعودی ودیگر متحدہ امارات جن مفروضہ بدگمانیوں میں سانس لے رہے ہیں کہ انہیں ایران سے ہمہ وقت خطرات لاحق ہیں انہیں وہ اپنے ذہنوں سے نکال دیں وہ دشمن کی سازشوں کو سمجھیں، مسلمہ امہ کی تباہی اور زوال کی داستانیں بہت طویل ہوچکی ہیں، ہمارے عالمی دشمن ہمیں بہت دنوں تک سے اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں تاخیر بہت ہوچکی لیکن آنکھیں کھولنے کا وقت اب بھی باقی ہے- اگر ہمیں روئے زمین پر اپنی داستان باقی رکھنی ہے تو ہمیں سنبھلنا ہی ہوگا اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم چلنا ہی ہوگا- چوں کہ ایران سب کچھ کرسکتا ہے- امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتا ہے، اس کی سرزمین پر اسے ہی چیلنج کرسکتا ہے- اسرائیل کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوششیں کرسکتا ہے، عراق وکویتی اہل تشیع کا تعاون کرسکتا ہے مگر وہ رسول اور آل رسول کی سرزمین پر حملہ آور ہوکر ان کے نقوش واثرات کو مٹانے کا سبب نہیں بن سکتا، اسے قندیل رہبانی سمجھ کر یک وتنہا نہ چھوڑیں یہ آئندہ مسلم دنیا کا سرمایہ افتخار بن سکتا ہے اس کی حفاظت کریں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے سیاسی نظریات کے اتباع کے لیے خود کو تیار کریں، چوں کہ کسی بھی خوش حال ملک کے لیے صرف دولت کی ریل پیل ہی کافی نہیں ہوتی، اپنے دفاع کے لیے دفاعی ہتھیار کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے، سیاسی بصارت وبصیرت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، یہ جبھی ممکن ہوسکتا ہے جب ہم ''واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولاتفرقوا'' پر عامل ہوکر اپنے ماضی کے اعلیٰ اقدار اور روایات پر نظر ڈالیں، اور ''لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کی مضبوط ومستحکم کڑی کی اہمیت کو سمجھیں- □□□

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی ☆

استاذ القرا قاری محمد یحییٰ

از خون دل گزاشت بہر جانشان خویش

دوسری قسط

عصر حاضر کے نامور ادیب ونقاد ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی کے قلم سے مشاہیر اہل سنت کی یادوں کا سلسلہ

اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ حافظ ملت دار العلوم اشرفیہ کو ایک عظیم سنی یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کا خاکہ بنا چکے تھے لیکن اس کو روبہ عمل لانے میں کچھ رکاوٹیں محسوس کرتے تھے چنانچہ یکم رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ کو سرپرست ادارہ حضرت سرکار کلاں کی خدمت میں یہ عریضہ پیش کیا:

مخدوم ومحترم عظیم البرکۃ سرپرست دار العلوم اشرفیہ مبارک پور دامت برکاتہم العالیہ السلام علیکم ورحمۃ!

دار العلوم اشرفیہ مبارک پور کے موجودہ انتظامی ڈھانچے کے متعلق اپنی بے اطمینانی کی وجہ ظاہر کر چکا ہوں اور اسی بنیاد پر میں نے سالانہ اجلاس میں اپنی علیحدگی کا اعلان کیا تھا لیکن آپ حضرات کے یقین دلانے پر کہ اشرفیہ کے مستقبل کے تحفظ کے سلسلے میں میری شکایتوں کا ازالہ فرمادیں گے میں نے مشروط طور پر اپنا فیصلہ واپس لے لیا تھا اب چوں کہ میرے فیصلے کی واپسی کا اعلان کردیا گیا ہے، تعطیل کلاں کے بعد مجھے حسب دستور مدرسہ آنا ہوگا لہذا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو مطلع کردوں کہ ۱۰ر شوال سے پہلے مجھے عملاً مطمئن کردیا جائے اور جیسا کہ کہہ چکا ہوں کہ جب تک مجلس انتظامیہ میں بنیادی تبدیلی نہ ہوگی میں کسی سطحی ترمیم سے مدرسہ کے مستقبل کو محفوظ نہیں سمجھوں گا اور میرے تئیں اس کی شکل صرف یہ ہے کہ ایوان بالا کی حیثیت سے مشاہیر علمائے کرام پر مشتمل گیارہ افراد کی ایک مجلس شوریٰ بنادی جائے جسے موجودہ انتظامی ڈھانچے پر ایک بااختیار نگراں اور دخیل کار کی طرح بالادستی حاصل ہو اور اس ایوان کی صدارت آپ کے ہاتھ میں ہو، یہ شکل اگر عمل میں نہیں لائی گئی تو میری شکایت بدستور باقی رہے گی اور اس کے نتیجے میں اپنی واپسی کے اعلان کا قطعاً پابند نہیں رہوں گا۔ ایام تعطیل کے اختتام تک آپ کے اطمینان بخش جواب کا شدت سے انتظار کروں گا۔ فقط عبد العزیز عفی عنہ، یکم رمضان ۱۳۸۸ھ۔

حافظ ملت نے اس خط میں جس بے اطمینانی کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ صدر ادارہ شیخ محمد رفیق انصاری (م ۱۹۶۸ء) کے انتقال کے بعد مجلس انتظامیہ کی صدارت کا مسئلہ پیش آیا۔ سرکار کلاں کی صدارت میں میٹنگ ہوئی، کمیٹی کے ایک معزز رکن جناب محمد ابراہیم صاحب نے ادارہ کے اس عظیم منصب کے لئے جناب شہید حسن اشرفی کا نام پیش کیا معاً بعد مولانا محمد احمد شاہدی صاحب نے حافظ ملت کا نام پیش کردیا یوں میٹنگ میں بدمزگی پیدا ہوگئی اور قصبہ میں بے بنیاد باتیں گشت کرنے لگیں جس سے حافظ ملت دل برداشتہ ہوئے۔ بالآخر انہوں نے دستار فضیلت کے اجلاس میں اپنے مستعفی ہوجانے کا اعلان کردیا۔

جب حافظ ملت کا گرامی نامہ سرپرست ادارہ کے پاس پہنچا تو آپ نے ۲۱ر رمضان کو یہ جواب مرحمت فرمایا:

"مکرمی ومحترمی زید الطافکم ...... علیکم السلام ثم السلام علیکم

والا نامہ تشریف لایا اور منتظمہ کے چند افراد بھی آئے چوں کہ اس سال آپ کے انداز سے اہل مبارک پور نے سمجھ لیا کہ اب آپ اپنی نوازشات سے مدرسہ کو محروم فرمانا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے انتشار بھی ہے۔ مختلف الخیالی بھی، لہٰذا انتظامیہ کمیٹی نے ۱۲ر شوال مقرر کرلی ہے، اس موقع پر آپ کے شرائط کمیٹی کے سامنے رکھے جائیں گے اس کے بعد پھر صحیح نتیجہ سے مطلع کروں گا، اپنے گھر کے سب چھوٹے بڑے کو حسب مراتب سلام ودعا کہہ دیجیے۔

سید محمد مختار اشرف

سجادہ نشین کچھوچھہ شریف فیض آباد، ۲۱ر رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ"

قارئین ملاحظہ فرمائیں حافظ ملت نے اپنے مکتوب میں لکھا تھا: "ایام تعطیل کے اختتام تک آپ کے اطمینان بخش جواب کا شدت سے انتظار کروں گا" اس کے جواب میں مجلس انتظامیہ کی میٹنگ کی تاریخ ایام تعطیل کے اختتام کے بعد کی مقرر کی جارہی ہے اور جس

☆T-181,2nd Floor,Model Basti,Chamelian Road,New Delhi -5

مجلس انتظامیہ میں بنیادی تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا تھا اسی مجلس انتظامیہ کے سامنے ''شرائط'' رکھی جارہی ہیں۔نتیجہ ظاہر ہے، جب حالات کی سنگینی کو سرپرست ادارہ نے محسوس کیا تو مورخہ ۶ رجنوری ۱۹۶۹ء کو آپ مبارک پور تشریف لائے ناظم اعلیٰ قاری محمد یحییٰ صاحب کو میٹنگ کے لئے ایجنڈا جاری کرنے کا حکم دیا۔ناظم صاحب نے حسب ذیل ایجنڈا جاری کیا۔

''(۱) حافظ ملت شیخ الحدیث صاحب دارالعلوم ہذا کے استعفا اور پھر مشروط واپسی کے نتیجے میں جماعتِ اہلِ سنت کے اندر جو ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اسے دارالعلوم اشرفیہ کی ورکنگ کمیٹی انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کی قطعی رائے ہے کہ اس ہیجان خیز ماحول میں جذبات سے بالاتر ہوکر مکمل سنجیدگی سے کام نہ لیا گیا تو جماعت یقینی طور پر افتراق کا شکار ہوجائے گی جس کا لازمی اثر دارالعلوم اشرفیہ کی کارکردگی پر پڑے گا اور یہ ایسا مذہبی اور ملی نقصان ہوگا جس کی تلافی ناممکن ہوگی۔

(۲) جناب شیخ الحدیث صاحب دارالعلوم اشرفیہ نے اپنی واپسی کی جو شرط تحریر فرمائی ہے اس کے بارے میں جماعت اہلِ سنت دوحصوں میں بٹ چکی ہے اور یہ صورت حال ہمارے مستقبل کے لیے انتہائی خطرناک ہے اس لئے ضروری ہے کہ عوام کے سامنے کوئی ایسا حل پیش کیا جائے جس سے شیخ الحدیث حافظ ملت کی اصل شکایت بھی رفع ہوجائے اور عوام کے اندر اتحاد واتفاق کی لہر بھی دوڑ جائے۔''

میٹنگ میں جب معزز ممبران کے سامنے یہ ایجنڈے آئے تو اتفاق رائے سے درج ذیل فیصلہ کیا گیا جس پر سرپرست ادارہ نے جو میٹنگ کی صدارت فرمارہے تھے دست خط کیے اور مہر ثبت کی۔

''حافظ ملت مولانا عبدالعزیز صاحب شیخ الحدیث مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کے استعفا نامہ سے پیدا شدہ بحرانی حالات ختم کرنے اور ایک خوشگوار فضا بنانے نیز مدرسہ اشرفیہ کے مستقبل کی آئینی بقا و استحکام کی خاطر دستوری سطح پر درج ذیل ترمیمات کی جاتی ہیں۔

(۱) یہ کہ دارالعلوم مدرسہ اشرفیہ کی ایک مجلس شوریٰ پانچ بیرونی علمائے کرام پر مشتمل ہوگی جس کا چیئرمین سرپرست مدرسہ ہوگا۔

(۲) یہ کہ مجلس منتظمہ یا جنرل کمیٹی کے اختلافی مسائل مجلس شوریٰ میں پیش کیے جائیں گے اور باہمی مشاورت کے بعد چیئرمین کا فیصلہ آخری اور ناطق سمجھا جائے گا۔

(۳) یہ کہ مجلسِ شوریٰ کے اکابر علماء کے انتخاب یا نامزدگی کا دستوری حق صرف سرپرست مدرسہ ہذا کو ہوگا۔

(۴) یہ کہ مدرسہ اشرفیہ کا کوئی ملازم یا مدرس مجلس منتظمہ کا ممبر یا رکن نہیں ہوگا اور نہ اسے انتظامی امور میں کسی طرح کی مداخلت کا حق رہے گا۔''

جیسا کہ مذکور ہوا جنرل کمیٹی نے اتفاق رائے سے یہ تجاویز پاس کیں۔قارئین کو معلوم ہو کہ یہ جنرل کمیٹی کوئی باضابطہ منتخب جنرل کمیٹی نہیں تھی بلکہ اس میٹنگ میں انتظامیہ کمیٹی کے اراکین، قصبہ کے بعض ذمہ دار افراد اور سرپرست صاحب کے ہمراہ آئے ہوئے بزرگوار شریک تھے۔اس میٹنگ کے دوسرے دن یعنی ۷ رجنوری ۱۹۶۹ء کو سرپرست ادارہ نے اپنی صدارت میں درج ذیل پانچ اکابر علما پر مشتمل مجلس شوریٰ تشکیل دی۔

مولانا سید غلام جیلانی صاحب میرٹھی، مولانا عبدالرشید خاں ناگ پوری، مولانا محمد یونس صاحب مرادآبادی، مولانا قاضی شمس الدین صاحب جونپوری، مولانا محمد سلیمان صاحب بھاگل پوری اور ناظم اعلیٰ کو ہدایت دی کہ ان حضرات کو میٹنگ کی کارروائی سے باخبر کردیا جائے لیکن یہ ساری کارروائی ایک طرح کی خانہ پری ثابت ہوئی یعنی ۷ رجنوری ۱۹۶۹ء کی میٹنگ کے بعد اپریل ۱۹۷۱ء تک اس مجلس شوریٰ کی نہ کوئی میٹنگ ہوئی نہ ادارہ کی کھوج خبر لی گئی۔نتیجہ کار حافظ ملت کی شکایت بدستور باقی رہی اور مبارک پور کو خیر باد کہنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔

جیسے ہی قصبہ میں حافظ ملت کے مبارک پور چھوڑ کر جانے کی خبر پھیلی عوام وخواص دم بخود رہ گئے۔اور جیسا کہ میں ''تذکار'' میں حافظ ملت کے سلسلہ ذکر میں تحریر کرچکا ہوں ایک وقت آیا جب قصبہ او رمضافات کے سنی عوام نے حافظ ملت کو ادارہ کے تعلیمی تنظیمی اور مالی جملہ شعبوں کا مکمل اختیار دے دیا جب یہ خبر کچھوچھہ پہنچی تو سرکار کلاں مبارک پور تشریف لائے آپ کے ساتھ آپ کی مجلس شوریٰ کے ارکان کے علاوہ مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی اور جناب سید حسن مثنیٰ انور بھی آئے۔

اشرفیہ کے صدر دفتر میں ناظم اعلیٰ اور مولانا علی احمد صاحب نے استقبال کیا بیٹھتے ہی مثنیٰ میاں صاحب نے قاری صاحب سے کہا کہ ناظم صاحب ایجنڈا جاری کیا جائے۔میٹنگ میں حالات حاضرہ پر غور وخوض ہوگا ناظم صاحب نے کہا کہ مبارک پور کے عوام دارالعلوم اشرفیہ

کے تمام اختیارات حافظ ملت کو سونپ چکے ہیں اب نہ تو کوئی کمیٹی ہے نہ کوئی عہدہ دار یہ سننا تھا کہ مولانا مظفر میاں صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا شنی میاں کے چبھتے ہوئے جملوں نے اور بھی آگ میں تیل کا کام کیا اس دن واضح طور پر دیکھا گیا کہ ان اکابر کی کمان شنی میاں کے ہاتھ میں تھی، سرکار کلاں سے کہا گیا کہ حضرت اٹھئے -اب ہمارا یہاں کیا کام؟ چنانچہ یہ حضرات ایک گلاس پانی پیے بغیر دفتر سے اٹھ گئے پانی پیش کیا گیا اس پر بھی فقرے کسے گئے-اب یہاں سے محمد طفیل اشرفی کے گھر گئے وہاں سے شہر اعظم گڈھ گئے غالباً وہیں رات میں قیام کیا پھر کچھوچھہ شریف سے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جو قومی آواز میں ۳۱ رمئی کو شائع ہوا جس کی نقل درج ذیل ہے-

''دار العلوم میں اقتدار اعلیٰ! ممبران مجلس شوریٰ کا بیان-

کچھوچھہ شریف! ۲۳ رمئی دار العلوم اشرفیہ مبارک پور کی مجلس شوریٰ کے اعزازی ممبران مولانا سید غلام جیلانی صاحب میرٹھی مولانا محمد سلیمان صاحب شیخ الحدیث مدرسہ اظہار العلوم ماچھی پور، مولانا شمس الدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ حمیدیہ رضویہ بنارس، اور مولانا محمد یونس صاحب، مہتمم جامعہ نعیمیہ مرادآباد نے ایک مشترکہ بیان میں بتایا کہ گزشتہ ۲۲ رمئی کو جب وہ دار العلوم کے سرپرست مولانا سید مختار اشرف کی طلبی پر ان کے زیر قیادت مبارک پور پہنچے تو وہاں دار العلوم کے ناظم اعلیٰ قاری محمد یحییٰ نے انہیں بتایا کہ مبارک پور کے عوام نے ادارہ کا اقتدار اعلیٰ شیخ الحدیث مولانا حافظ عبد العزیز کو سونپ دیا ہے-اور اب یہاں نہ کوئی سرپرست ہے اور نہ مجلس شوریٰ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ مولانا عبد العزیز کسی کی ماتحتی میں رہ کر کام کرنے کے لیے تیار نہیں -مجلس شوریٰ کے ارکان نے کہا ہے کہ ان کا تقرر تقریباً دو سال قبل ادارہ کے سرپرست نے اس وقت کیا تھا جب مولانا عبد العزیز نے ادارہ کے استحکام کے لیے علما پر مشتمل مجلس شوریٰ مقرر کیے جانے پر اصرار اور بصورت دیگر مستعفی ہو جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ مولانا عبد العزیز کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کے موقف اور منشا اور رویہ کی تبدیلی کے پورے اسباب معلوم نہیں ہو سکے لیکن جو صورت حال اب پیدا ہو گئی ہے اس کے متعلق مبارک پور میں طرح طرح کے شبہات پائے جاتے ہیں -مجلس شوریٰ کے ارکان کا کہنا ہے کہ دار العلوم کی فضا کو مکدر ہوتے دیکھ کر ہم لوگ ۲۲ رمئی کو ہی وہاں سے ایک صاحب کے گھر چلے گئے اور رات میں جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو عوام کے جم غفیر نے سرپرست زندہ باد اور ممبران مجلس شوریٰ زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے جو دور تک سنائی دے رہے تھے-مجلس شوریٰ کے ارکان کے ساتھ مولانا سید مظفر حسین سابق ایم پی مولانا حسن مثنیٰ انور مدیر المیزان اور ولی عہد سجادہ سرکار کلاں مولانا سید اظہار اشرف بھی مبارک پور گئے تھے-□□□......جاری ہے

بقیہ: تحریری مباحثہ

بلکہ اس کو مثبت نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے، اور ہم سب کو قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے اور اس بات کو بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلاف قرآن وحدیث سے منحرف نہیں تھے، بلکہ قرآن وحدیث ہی ان کا اصل سرمایہ تھا، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمارا تعلق بھی قرآن وحدیث سے مضبوط ہوگا -اسلاف کی عظمت لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوگی اور مختلف علوم وفنون میں جو الحاقات ہو گئے ہوں گے وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں سامنے آجائیں گے، بشری لغزشیں بھی الگ ہو جائیں گی اور پھر ایک ایسی فکر سامنے آئے گی جس کا بنیادی سرچشمہ قرآن وحدیث ہوگا، جس میں تصوف کی روحانی چاشنی اور نکھرے ہوئے فقہ ظاہر کی چمک بھی ہوگی، گویا ہم عصر اول کی طرف پلٹ چلیں گے اور اپنے اسلاف کے سرمایہ سے بھی ہم ہمیشہ قابل قدر انداز میں استفادہ کر سکیں گے اور پھر ہم اسلام کے تمام دینی ودنیاوی مسائل، مقاصد شریعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حل کر سکیں گے اور نتیجتاً اس صدی میں ہم ایک متوازن مذہبی نظام پیش کرنے میں کامیاب ہوں گے، اس کی بنیاد پر غیر اسلام سے قریب ہو کر اس کے دامن میں پناہ لیں گے، بچھڑے ہوئے اپنے گلے مل جائیں گے، گلے شکوے دور ہوں گے، مولیٰ تعالیٰ کی طرف توجہ بڑھے گی، اور پھر اس وقت سب لوگ عالم کی حقیقی تعریف، اس کی خصوصیات سے آگاہ ہوں گے اور پھر کوئی کسی سے عالم ہونے کے لیے مدرسہ کی سند کا مطالبہ نہیں کرے گا- بلکہ بہر صورت حقیقت پسندانہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا-

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صفات ذمیمہ سے پاک ہو کر، صفات حمیدہ سے آراستہ ہو کر، حقیقی معنوں میں عالم بننے اور اپنی طرف ہر معاملہ میں متوجہ رہنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہم سب کا سینہ اپنی خشیت سے معمور فرمائے- آمین-

کیا عالم ہونے کے لیے مدارس کی سند فراغت ضروری ہے؟

نوٹ:- ماہنامہ "جام نور" اپنے اس کالم میں عصر حاضر کے کسی بھی مسئلہ کے تحت ہندوستان کے نامور علمائے کرام ودانشوران قوم و ملت سے ان کی تحریری رائے لیتا ہے- موصول ہونے والی آراء خواہ وہ مثبت یا منفی پہلو پر ہوں، شائع کی جاتی ہیں تاکہ متعلقہ مسئلے کے دونوں پہلو ارباب علم ونظر اور عام قارئین تک پہنچ سکیں اور متعلقہ مسئلہ پر علمائے کرام ودانشوران قوم کی تحقیقی وتجزیاتی رائے کی روشنی میں مسئلے کے صحیح نتائج برآمد ہوسکیں، علما ودانشوران کی سہولت کے پیش نظر مندرجہ بالا سوال سے متعلق چند ذیلی نکات بھی دیے گئے تھے، تاکہ مندرجہ ذیل خطوط پر دلائل وبراہین کے ساتھ وہ اپنا تحقیقی جواب دے سکیں............................ (ادارہ)

نکات

{1} شریعت میں کتنا علم حاصل کرنا فرض ہے؟ اور تبلیغ ودعوت کے لیے کتنا علم لازم ہے؟

{2} عالم کا اطلاق کس پر ہوتا ہے؟ کیا عالم کہلانے کے لیے مدرسے کا فارغ ہونا ضروری ہے؟

{3} آج جو لوگ ذاتی مطالعے، عصری بصیرت اور اخلاص کے ساتھ ملکی وعالمی تبلیغ ودعوت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، انہیں عالم نہ ہونے کا طعنہ دینا کتنا درست ہے؟

{4} وعظ ونصیحت، تقریر وخطابت، دعوت وتبلیغ، تحریر وصحافت، تحقیق وتعلیق اور افتا وقضا جیسے امور میں کس کے لیے کون سی علمی لیاقت درکار ہے؟

{5} عصر حاضر میں مذہبی علم وفکر کا معیار کیا ہے اور مستقبل میں اس کے امکانات کیا ہیں؟

> "حصول علم کے وسائل مختلف ہوسکتے ہیں، جس وسیلہ وذریعہ سے بھی کوئی علمی لیاقت حاصل کرلے تو وہ عالم ہے اور اس کے لیے مدارس کی سند فراغت ضروری نہیں ہے، اس کا علم خود ہی اس کی سند ہے"

ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی☆

دعوت وتبلیغ کے حوالے سے داعی اعظم جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے تاریخی خطاب میں جو ارشاد فرمایا ہے وہ قیامت تک کے لیے آپ کا کلمہ پڑھنے والوں کے لیے دستور العمل ہے- آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فلیبلغ الشاهد منکم الغائب جو یہاں موجود ہیں وہ میری بات ان تک پہنچادیں جو موجود نہیں ہیں- ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مخاطبین میں اس وقت صرف خلفائے راشدین نہیں تھے اور نہ ہی صرف عشرۂ مبشرہ تھے بلکہ ہر طرح کے صحابی اس وقت موجود تھے، نبی کریم ﷺ نے بغیر کسی استثنا کے سب کے لیے یہ عام حکم فرمایا کہ وہ رسول کی بات کو دوسروں تک پہنچائیں- اسی بات کو دوسری حدیث میں یوں بھی کہا گیا ہے: بلغوا عنی ولو آیۃ میری طرف سے ایک بات ہی سہی، دوسروں تک پہنچادو- (بخاری) ان دونوں حدیثوں سے دعوت وتبلیغ کے تعلق سے ایک عام رہنمائی یہ ملتی ہے کہ دین کی بات جس کے پاس جتنی ہو اسے دوسروں تک ضرور پہنچانی چاہیے- تبلیغ کے لیے عالم وفاضل اور سند یافتہ ہونے کی شرط لگانا غیر ضروری ہے- نبی کریم ﷺ نے اپنے بعض اصحاب کو یہ حکم فرمایا کہ وہ دوسری زبانیں سیکھیں تاکہ دوسری قوموں تک اسلام کی بات پہنچانا آسان ہوسکے- عصر حاضر میں اسلامی دعاۃ ومبلغین کو بھی اس حدیث کی روشنی میں دوسری زبانیں سیکھنی چاہیے تاکہ وہ اسلام کا آفاقی پیغام دوسری قوموں تک پہنچا سکیں- اصحاب رسول کے بارے میں ایک بات یہ بھی تاریخ میں ملتی ہے کہ صحابہ رسول گرامی ﷺ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش

☆naushadchishti@yahoo.com,Mob:09412562751

کرتے-آج رسول گرامی ﷺ کا کلمہ پڑھنے والے ہر مسلمان کو بھی چاہیے کہ اسے دین کی جتنی بات صحیح طور پر معلوم ہو وہ دوسروں تک پہنچائے-دعوت وتبلیغ کے لیے اس بات کا انتظار نہ کرے کہ جب وہ مدرسے سے سند لے لے گا تب اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچائے گا-ہاں!ایک بات کا لحاظ رکھنا اشد ضروری ہے کہ جو بات جسے معلوم نہ ہووہ صرف قیاسات وتخمینات کی بنیاد پر دوسروں کو نہ بتائے بلکہ فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون (اگر علم نہ ہوتو اہل علم سے دریافت کرو) کے مطابق وہ اہل علم سے دریافت کرے اس کے بعد ہی دوسروں کو بتائے-اس تمہیدی گفتگو کے بعد اپنے سوالات کے جوابات بالترتیب ملاحظہ فرمائیں:

(۱) کوئی شخص اگر ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے جو عالم کے متعلق ہوا کرتے ہیں تو یقیناً وہ عالم ہے-اب یہ لیاقت واستعداد اس نے خواہ مدارس سے حاصل کی ہو یا ذاتی مطالعے سے یا کسی اور طریقے سے-قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں حصول علم کے لیے کسی مخصوص جگہ کی قید اور سند کا تعین نہیں ہے اس لیے حصول علم کے وسائل وذرائع مختلف بھی ہو سکتے ہیں لیکن وہ وسائل وذرائع صالح ومفید ہونے چاہیے-اب جس وسیلہ وذریعہ سے بھی کوئی شخص علمی لیاقت حاصل کر لے تو ایسا شخص عالم ہے اور اس کے لیے مدارس کی سند فراغت ضروری نہیں ہے-اس کا علم خود ہی اس کی سند ہے-شریعت میں علم ضروری کا حاصل کرنا فرض ہے یعنی جائز وناجائز اور حرام وحلال میں فرق وامتیاز کی صلاحیت پیدا کرنے کا علم، جس کا مطالبہ شریعت ہر مسلمان سے کرتی ہے-

(۲) ایک مبلغ وداعی کے لیے اتنا ہی علم لازم ہے جتنا اس کا دائرۂ دعوت وتبلیغ وسیع ہو، کسی بھی داعی ومبلغ کا اس ہوش ربا دور میں اتنا علم حاصل کرنا جو دعوت وتبلیغ کے ہر شعبے کے لیے کافی ہو غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے-اس لیے دعوت وتبلیغ کے شعبہ جات، جیسے توحید، نماز، روزہ، زکوۃ وحج وغیرہ ان میں جس شعبہ میں کار دعوت وتبلیغ کرنا چاہتا ہے اس میں مہارت تامہ اور عملی مشق لازم ہے، تا کہ بحسن وخوبی اس کام کو انجام دے سکے، ورنہ ہوتا یہ ہے کہ مسائل کی معلومات تو خوب ہوتی ہے مگر ان کا نفاذ خود مبلغ وداعی کی شخصیت سے مفقود ہوتا ہے-

(۳) جو لوگ خارجی مطالعے سے حالات زمانہ کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خلوص کے ساتھ فریضۂ دعوت وتبلیغ کا کام انجام دے رہے ہیں، خواہ وہ دعوت وتبلیغ کا کام علاقائی وضلعی پیمانے پر ہو خواہ ملکی وعالمی پیمانے پر، بلاشبہ وہ اصحاب، اہل علم وبصیرت ہیں-انہیں بے علم کہنا یہ تو تنگ نظری ہے یا پھر بغض وعناد-یوں بھی کسی مسلمان کو یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے کسی بھائی پر طعنہ زنی کرے یا اس سے بدگمانی رکھے-یہ شریعتِ اسلامی کی روح کے خلاف ہے-خود قرآن کہتا ہے کہ بعض ظن گناہ ہے-ان بعض الظن اثم -

(۴) وعظ ونصیحت، تقریر وخطابت، تحریر وصحافت اور تحقیق وتعلیق کے لیے اتنی علمی لیاقت ضروری ہے کہ یہ مفید اور گراں قدر خدمات حق وصداقت اور خوش گفتاری اور حسن سلوک کے ساتھ انجام دی جا سکیں-مندرجہ بالا شعبوں سے متعلق ایسی معلومات ہو کہ بوقت ضرورت پیش کردہ مذکورہ چیزوں پر ثبوت فراہم کیا جا سکے-رہا افتا وقضا کا معاملہ تو یہ بڑے اہم شعبے ہیں جن کے لیے آیات احکام، حدیث وتفسیر، فقہ واصول اور ائمہ وعلما کی بیان کردہ تصریحات کا علم درکار ہے-صحیح معنوں میں مفتی وقاضی کو ایسی ہی لیاقت کا حامل ہونا چاہیے-رہا نقل مسائل کا معاملہ تو یہ کام ہر ذی شعور عالم کر سکتا ہے-رہ گیا قضا کا معاملہ تو یہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے-اگر قاضی کی شخصیت متنازع فیہ ہے، بصیرت وبصارت میں کسی طرح کی کمی ہے، تو علمائے اصول کے نزدیک یہ اس کے اندر عیب ہے اور ایسے عیب دار شخص کو قضا کا منصب نہیں دیا جا سکتا-

(۵) عصر حاضر میں علم وفکر کا مذہبی معیار بہت محدود ہے جو خود عصر حاضر کی تقاضوں کے لیے ہی ناکافی ہے جب کہ ہم نے اسے کافی سمجھ رکھا ہے اور حالات کچھ اس طرح ہیں کہ

الجھی ہے میری فکر زمینی محاذ میں ڈالیں گے پھر کمند کبھی آسمان پر

شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ہر میدان میں سمٹ کر رہ گئے ہیں-اب ہمیں اپنا دائرۂ علم وفکر کو وسیع کرنا ہوگا اور مستقبل کے حالات کو ابھی سے محسوس کرتے ہوئے کوئی ایسا لائحۂ عمل ترتیب دینا ہوگا کہ مستقبل کے خطرات وخدشات سے قوم مسلم کی حفاظت وصیانت ہو سکے اور فریضۂ دعوت وتبلیغ زمانی تقاضوں کے پیش نظر عام سے عام تر کیا جا سکے-□□□

نوٹ: یہ تحریر مولانا مسعود احمد مصباحی، استاذ: مدرسہ شمس العلوم، مہنگاؤں، فتح پور، یوپی کے اشتراک فکر سے لکھی گئی ہے-

"عالم ہونے کے لیے کسی مدرسے کا فارغ ہونا ضروری نہیں، بلکہ بہت ممکن ہے کہ کسی بہت بڑے مدرسے کا سند یافتہ محض جاہل ہو اور دوسرا شخص جس کی ظاہری درس وتدریس مکمل نہ ہو، وہ بہت سے مفتیوں پر فائق ہو"

مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی☆

اسلام کا اول ہی درس تعلیم ہے، البتہ اسلام اس بات کا داعی نہیں ہے کہ کسی بھی علم کو، خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے، محض تفنن کے لیے یا محض اس لیے حاصل کیا جائے تا کہ اس میں تبحر حاصل کر کے دنیاوی منفعتوں اور مادی آسائشوں کی تکمیل کی جائے، بلکہ اس سلسلے میں اسلام کا یک نکاتی فارمولہ ہے کہ علم کوئی بھی حاصل کیا جائے وہ علم بلاواسطہ یا بواسطہ خالق و مالک، صانع عالم کی ذات وصفات کی معرفت تک پہنچانے والا ہو، اور جو بھی علم، خواہ دینی ہو یا دنیاوی، مولیٰ تعالیٰ سے دور کرنے والا ہو یا اس علم میں مشغولیت حق تعالیٰ کی جانب مائل کرنے کے بجائے مولیٰ سے دوری، شریعت سے روگردانی، معاصی پر جری بنانے اور دنیاوی سیم وزر کی حرص وہوس کو رگ وپے میں بسانے کا ذریعہ ثابت ہو، اس علم کی تحصیل اس شخص کے حق میں درست نہیں ہوگی- اسی لیے علمائے اسلام نے علم پر گفتگو کرتے وقت علم کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے-(۱) علم محمود (۲) علم مذموم، جو علوم محمود ہیں ان میں کچھ علوم تو فرض عین ہیں اور کچھ فرض کفایہ اور کچھ سنت ومستحب- اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: طلب العلم فریضة علی کل مسلم -(سنن ابن ماجہ، کتاب العلم، باب فضل العلما والحث علی طلب العلم، رقم حدیث: ۲۲۴) اس حدیث پاک میں جس علم کو فرض عین قرار دیا گیا ہے، اس کے بارے میں علمائے کرام کے مختلف اقوال ہیں، اس سلسلے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے امام احمد رضا قدس سرہ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے دین میں جن علوم، کا بالفعل محتاج ہے ان علوم کا سیکھنا فرض عین ہے مثلاً وہ عقائد جن کا علم حاصل کر کے انسان اپنا عقیدہ اسلام اور اہل سنت کے مطابق کر سکے- اس کے بعد نماز، روزہ، زکوۃ، حج، نکاح، خرید وفروخت، زراعت وغیرہ، غرض یہ کہ جو بھی اس وقت جس حالت میں ہو اس کے حال کے لحاظ سے متعلقہ مسائل کا جاننا فرض عین ہے- حلال وحرام، اور ان علوم کا جاننا بھی فرض عین ہے جن کا تعلق قلب وباطن سے ہے- مثلاً اخلاق کا علم جن سے آراستہ ہو کر قلب وسینہ کو نورانی اور اپنے ظاہر کو آراستہ اور پیراستہ کیا جا سکے، مثلاً حلم وتواضع، حسن خلق، ایثار واخلاص، توبہ اور خندہ روئی وغیرہ، ان بری صفات کا علم جن سے ظاہر وباطن کو پاک کرنا ضروری ہے مثلاً عجب وغرور، حرص وہوس، کبر وریا، جھوٹ، غیبت، چغل خوری، بہتان وغیرہ اور وہ علوم جن کے ذریعہ بندہ کو اس بات کی معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اس وقت اس کے قلب کی حالت کیسی ہے اور اس وقت رب تعالیٰ کے ساتھ اس کا تعلق کیسا ہے- ان سارے علوم کا بقدر ضرورت جاننا فرض عین ہے اور جن علوم کی تحصیل دینی ضرورت سے زائد ہوگی وہ فرض کفایہ یا سنت ومستحب کہلائیں گے، (دیکھیے فتاویٰ رضویہ، ج ۲۳، مسئلہ ۲۹۸، ص ۱۲۸)

اب رہا یہ سوال کہ دعوت وتبلیغ کے لئے کتنا علم ضروری ہے تو اس سلسلے میں صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یایها الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک- اے رسول ﷺ! آپ کے رب کی طرف سے جو آپ کی جانب اتارا گیا ہے اسے پہنچا دیجیے-(المائدہ: ۶۷) اور حدیث شریف میں آیا ہے: بلغوا عنی ولو آیة (صحیح بخاری کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل)- اور دوسری حدیث میں ہے: نضر اللّٰہ امرأ سمع منا حدیثا فبلغه کما سمعه- اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو تاباں رکھے جس نے میری بات کو سنا اور پھر بغیر کسی تبدیل وتحریف کے جس طرح سنا تھا اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیا-(سنن دارمی، باب الاقتداء بالعلماء)

مذکورہ بالا آیت کریمہ اور احادیث طیبہ میں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ دین کی کوئی بھی بات ہم تک اگر پہنچی ہو تو ہم بغیر کسی تبدیل وتغیر کے اس کو دوسروں تک منتقل کر دیں- یہاں ایسی کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے کہ جب تک تمام شرعی علوم کا احاطہ نہ ہو تب تک دین کی کوئی بات دوسروں تک نہیں پہنچائی جا سکتی- مثلاً کوئی شخص اگر اسلام کے اس عقیدے سے واقف ہے کہ مدبر کائنات صرف رب تعالیٰ ہے اور وہ کسی کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے تو اس وقت اس شخص کو یہ بتانا چاہیے کہ درست عقیدہ یہ ہے اور اس کا عقیدہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں، یہ کام بھی دعوت وتبلیغ میں شامل ہوگا اور یہاں پر اس بات کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ اصطلاحی عالم دین بھی ہو، لیکن یہ ایک خاص سطح کی دعوت وتبلیغ

☆258, Kaveri Hostel, J.N.U. New Delhi-67 mzralimi@gmail.com

ہوگی یہاں پر صرف اتنا ضروری ہوگا کہ وہ ان علوم سے واقف ہو جن کا جاننا فرض عین ہے، یا پھر وہ کسی ایسے امیر کی رہنمائی میں یہ کام انجام دے جو اصول دین ودعوت سے واقف ہو، یہ بات اس لیے کہی جا رہی ہے کہ بہت سی مثالیں نبی کریم ﷺ کی زندگی میں ایسی ملتی ہیں کہ مختلف وفود نے آپ کے پاس آکر اسلام قبول کیا اور آپ نے انہیں اسلام کے بنیادی عقائد سے واقف کرایا اور پھر آپ نے ان میں سے کسی ایک کو امیر منتخب کر کے انہیں اپنے قبیلہ یا دوسرے قبائل میں جا کر تبلیغ کرنے کا حکم دیا، اب ظاہر ہے کہ جس صحابی کو آپ نے امیر بنا کر بھیجا انہیں ہم اصطلاحی عالم دین نہیں کہہ سکتے لیکن اس کے باوجود انہوں نے تبلیغ ودعوت کا فریضہ انجام دیا- دوسری طرف دعوت کی ایک دوسری سطح ہوگی جہاں ماہرین و متخصصین کی ضرورت ہوتی ہے اور جامع شخصیت کی حاجت ہوتی ہے اور اس کی مثالیں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر بعد میں صحابہ کرام کے عہد میں مل جاتی ہیں- مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور دوسرے وہ صحابہ جو علوم اسلامی کے متخصصین اور ماہرین میں سے تھے ان کی دعوت وتبلیغ کی سطح ذرا مختلف اور بلند تھی، عصر حاضر میں بھی دعوت وتبلیغ کی دونوں سطحیں موجود ہیں اور دونوں کے لائق کار افراد کو اپنے اپنے میدان میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینا چاہیے اور کسی کو ایک دوسرے کے ساتھ تعرض نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی ایک دوسرے کے میدان میں جبری طور پر داخل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے-

حاصل یہ ہے کہ جہاں پر صرف کلمہ وایمان، اصول وعقائد اور بنیادی شرعی مسائل کی تبلیغ کی بات ہو وہاں پر جو شخص خود ان علوم سے واقف، مخاطب کی ذہنی سطح سے باخبر اور ان بنیادی دعوتی اصول سے آشنا ہو جس کے ذریعہ وہ اپنی بات موثر طریقہ پر پیش کر سکے تو وہ شخص ان باتوں کی دعوت وتبلیغ کا کام انجام دے سکتا ہے- اور جہاں دعوت کی سطح بلند اور آفاقی ہو تو اس زمرہ کے داعی کے لیے بھی یہ ضروری ہوگا کہ وہ بذات خود اسلامی اصول وعقائد سے آراستہ، بنیادی مسائل سے آگاہ، روح اسلام سے آشنا، اپنے میدان تبلیغ کے مختلف پہلوؤں سے باخبر اور اس کے لیے ضروری مواد پر گہری نگاہ رکھنے والا، مخاطب کی ذہنی سطح سے باخبر مختلف ناگہانی صورت حال میں وحی متلو اور غیر متلو کے نور سے اپنی عقل کو منور کر کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والا ہو، غرض یہ کہ دعوت کی سطح جس قدر بلند ہوتی جائے گی اسلامی اصول کے علاوہ مقاصد شریعت اور روح اسلام سے آگہی اور متعلقہ میدان تبلیغ کے لیے ضروری مواد سے گہری واقفیت کی ضرورت بڑھتی چلی جائے گی اور داعی کوئی بھی ہو اور دعوت کسی بھی سطح کی اس کو یہ یقین اور یہ علم ضروری طور پر حاصل ہونا چاہیے کہ ہماری نماز، ہماری قربانی، ہماری زندگی اور ہماری موت اس اللہ واحد کے لیے ہے جو سارے جہاں کا پالنہار ہے اور اگر یہ یقین واذعان نہ ہو تو درحقیقت ایسے شخص کو دعوت وتبلیغ کا کام انجام دینے کا حق ہی نہیں ہے-

ابھی علم کے تعلق سے جو گفتگو ہوئی اس سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ جن علوم کا حصول فرض عین ہے اس کے لیے مدرسہ میں جانا اور وہاں جا کر تعلیم حاصل کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نے مدرسہ کی کبھی صورت بھی نہ دیکھی ہو اور وہ فرض قرار دیے گئے علوم سے آراستہ وپیراستہ ہو، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے سیکڑوں فارغین مدارس اور سندی عالم سے بہتر ہو، بالکل یہی معاملہ عالم ہونے اور مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے کا بھی ہے، عالم ہونے کے لیے کسی مدرسہ کا فارغ ہونا ضروری نہیں بلکہ بہت ممکن ہے کہ کسی بہت بڑے مدرسہ کا فارغ التحصیل سند یافتہ محض جاہل ہو اور دوسرا شخص جس کی ظاہری درس وتدریس مکمل نہ ہو وہ بہت سے مفتیوں پر فائق ہو- بلکہ موجودہ زمانے میں عمومی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ مدارس کے سند یافتہ علما کی ایک بڑی جماعت ایسی ہے جن کا عالم ہونا تو دور کی بات جو علوم فرض عین ہیں وہ ان سے بھی آگاہ نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بہت سے اسلامی اصول وعقائد سے بھی ناواقف ہوں یا ان کا یقین واذعان حاصل نہ ہو- امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ اسی طرح کے ایک سوال کا جواب تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سند کوئی چیز نہیں، بہتیرے سند یافتہ محض بے بہرہ ہوتے ہیں اور جنھوں نے سند نہ لی ان کی شاگردی کی لیاقت بھی ان سند یافتوں میں نہیں ہوتی، علم ہونا چاہیے اور علم الفتویٰ پڑھنے سے نہیں آتا جب تک کسی طبیب حاذق کا مطب نہ کیا ہو، مفتیان کامل کے بعض صحبت یافتہ کہ ظاہری درس وتدریس میں پورے نہ تھے مگر خدمت علماء کرام میں اکثر حاضر رہتے اور تحقیق مسائل کا شغل ان کا وظیفہ تھا، فقیر نے دیکھا ہے کہ وہ مسائل میں آج کل کے صدہا فارغ التحصیلوں بلکہ نام کے مدرّسوں بلکہ نام کے مفتیوں سے بدرجہا زائد تھے، پس اگر کوئی شخص مذکور فی السوال خواہ بذات خود خواہ بفیض

صحبت علماء کاملین علم کافی رکھتا ہے، جو بیان کرتا ہے غالباً صحیح ہے اس کی خطا سے اس کا صواب زیادہ ہے تو (مسائل بیان کونے میں) حرج نہیں"۔
(فتاوی رضویہ، ج ۲۳، مسئلہ ۳۱۶، ص ۱۶۴)

اب رہی یہ بات کہ عالم کا اطلاق کس پر ہوتا ہے تو اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (علماہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔ فاطر: ۲۸) اور یہ آیت کریمہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے جو شخص اصطلاحی عالم ہو اور اس میں خشیت نہ ہو تو اسے علما کے زمرے میں شمار ہی نہ کیا جائے۔

تفسیر امام زاہد میں اسی آیت کریمہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ جس شخص کے اندر خشیت نہ ہو وہ اس آیت کی رو سے عالم نہیں اگر چہ ہزار ہا مسائل کا علم رکھتا ہو اور جو شخص ایک مسئلہ کا علم رکھتا ہو اور وہ خشیت والا اور اپنے علم پر عامل ہو تو عالم ہے۔ (مجمع السلوک، شیخ سعد بن بڈھن خیر آبادی ج:۱، مخطوطہ رضا لائبریری رام پور)

اسلاف کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک بالاتفاق عالم کا اطلاق علمائے آخرت پر ہوا کرتا تھا، جزئیات اور فرعیات میں تبحر رکھنے والے پر نہیں جو آخرت سے غافل اور دنیا کی طرف مائل ہو، اس سلسلے میں قرآن واحادیث کی روشنی میں سب سے اچھی بحث احیاء العلوم کی پہلی جلد میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، پہلی جلد کے چھٹے باب میں انہوں نے علما کو دو گروہوں میں بانٹا ہے، علمائے دنیا او رعلمائے آخرت اور پھر ان دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچنے والی علامتوں پر مفصل گفتگو کی ہے۔ اس باب کے آغاز میں ہی انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ علمائے دنیا سے ان کی مراد علمائے سوء ہے اور پھر انہوں نے علمائے سوء کی تعریف یہ کی ہے کہ علمائے دنیا یا علمائے سوء وہ ہیں علم سے جن کا مقصود دنیاوی نعمتوں کا حصول اور جاہ و مرتبہ تک رسائی ہے، علمائے آخرت کی علامتوں میں پہلی علامت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عالم کا کمترین درجہ یہ ہے کہ اس کو دنیا کی حقارت، اس کی خست، اس کی کدورت اور اس کے فانی ہونے سے آگاہی حاصل ہو اور آخرت، اس کی عظمت، اس کی بقا اور آخرت کی نعمتوں کی عمدگی کا اسے ادراک ہو اور جو اس سے آشنا نہ ہو اس کی عقل میں فساد ہے، کیوں کہ یہ بات مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہے اور جس کے پاس عقل ہی نہ ہو وہ علما کے زمرے میں کیسے شامل ہو سکتا ہے، اور جس شخص کو آخرت کی عظمت اور اس کی پائیداری کا علم نہ ہو وہ کافر اور ایمان سے محروم ہے۔ اور جس کے پاس ایمان ہی نہ ہو وہ عالم کہاں ہوگا...... اور جو شخص ان تمام باتوں کا علم رکھتے ہوئے بھی دنیا پر آخرت کو ترجیح نہ دیتا ہو وہ شیطان کا اسیر ہے، اس کی خواہشات نے اس کو ہلاک کر دیا ہے اور اس کی شقاوت اس پر غالب آگئی ہے اور جس کی یہ حالت ہو وہ علما کے گروہ میں سے کیسے ہو سکتا ہے"۔ (احیاء العلوم الدین، ج ۱، باب سادس)

لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس دور میں ہمارا پیمانہ علم بالکل ہی بدلا ہوا ہے، اصطلاحی عالم محض سند یافتہ اور فارغین مدارس کو عالم سمجھا جا رہا ہے، اگر چہ جن کو عالم سمجھا جا رہا ہے ان کو اصول و عقائد اسلام سے آگاہی نہ ہو اور اس کا ان کو یقین واذعان حاصل نہ ہو، جھگڑالو، فتنہ پرور، بے عمل، حسن خلق سے بے بہرہ اور مذموم صفات کا پیکر ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ مدرسہ کا سند یافتہ ہے، اور جزئیات وفرعیات سے اسے خوب آگہی ہے، بڑا شاطر، محض خواہش نفس کے لیے تاویل پر تاویل کرنے والا ہے تو اسے عالم سمجھنا زیبا ہے۔ اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اعلام زمانہ، علوم ظاہر و باطنی سے آراستہ، تقویٰ شعار، زمانے کے نبض شناس، دین کا درد رکھنے والے افراد جو اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ ملکی و عالمی سطح پر دعوت و تبلیغ میں مصروف ہیں ان سے مدرسہ کی سند دکھانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور عالم نہ ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے اور ایسا اس لیے ہوا کہ چند ایسے الفاظ جو قرآن واحادیث میں وارد تھے اور قرن اول اور اسلاف کے زمانے میں اس سے جو معنی سمجھا جاتا تھا اس معنی کو ہی بدل دیا گیا، ان میں لفظ فقہ، علم، توحید، ذکر و تذکیر اور حکمت بھی ہے، چنانچہ فروع وفتاوی اور جزئیات و مسائل، ان کی علتوں کے علم کو ہی فقہ کا نام دے دیا گیا اور ان علوم میں جس کا جس قدر اشتغال رہا اسی قدر اسے فقیہ کہا جانے لگا، حالاں کہ عصر اول میں فقہ کا اطلاق مطلقاً راہِ آخرت کے علم، آفات نفس اور مفسدات اعمال کی معرفت، دنیا کی تحقیر، آخرت کی جانب توجہ اور غلبہ خوف الٰہی پر ہوا کرتا تھا اور ولیتفقھوا فی الدین ولینذروا (تا کہ انہیں دین کی سمجھ حاصل ہو جائے اور وہ لوگوں کو ڈرائیں۔ توبہ: ۱۲۲) سے اسی کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ یوں ہی لفظ علم کا اطلاق ذات وصفات وافعال الٰہی کے علم پر ہوتا تھا

لیکن علم وعلما کی ساری فضیلتیں علمائے ربانیین کے بجائے اختلافی فقہی مسائل اور مجادلہ ومناظرہ سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ خاص کر دی گئیں اور انہیں ہی در حقیقت عالم سمجھ لیا گیا اور جو اس سے الگ رہا اس کو اہل علم کے زمرے میں ہی شامل نہیں ہونے دیا گیا، یہی حال لفظ توحید کا بھی ہے کہ متکلمین کے کلامی مباحث اور جدل ومناظرہ والی بحثوں کو توحید، اور ان سے تعلق رکھنے والوں کو اہل عدل وتوحید قرار دے دیا گیا جب کہ قرن اول میں ایسا نہیں تھا اور لفظ توحید اس معنی میں نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ توحید کا معنی یہ تھا کہ خیر وشر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اسباب ووسائل موثر حقیقی نہیں ہیں اور یہ کہ خواہشات کی اتباع وپیروی سے اپنے آپ کو الگ کر دیا جائے اور اس طرح کے دوسرے اعلیٰ معانی میں لفظ توحید استعمال کیا جاتا تھا- اسی طرح لفظ ذکر وتذکیر اب صرف قصہ، کہانی، اشعار اور منظومات اور خلاف ظاہر باتوں کے بولنے میں سمٹ کر رہ گیا ہے جب کہ قرن اول میں یہ اس معنی میں مستعمل نہیں تھا بلکہ امور آخرت میں غور وفکر اور مولیٰ تعالیٰ سے تعلق کے معنی میں مستعمل تھا- یوں ہی لفظ حکمت بھی آج شاعر، نجومی اور طبیب پر بولا جانے لگا جب کہ قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں اس کی مدح کی گئی ہے اور قصہ، کہانی، بے ہودہ اشعار ومنظومات اور شطحات ایسی چیزیں ہیں جو شرعاً محمود نہیں ہیں- (احیاء علوم الدین، الباب الثالث، بیان مابدل من الفاظ العلوم- ملخصا) ان الفاظ کے معانی بدل جانے کی وجہ سے ہی ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اسی لیے علوم ظاہری وباطنی سے مزین ہونے کے باوجود بہت سے عاملین ومخلصین کو امام غزالی کے زمانے میں بھی جزئیات وفرعیات میں تبحر نہ ہونے کے سبب عالم نہیں سمجھا گیا اور آج بھی اسی بنا پر بعض مصلحین، مبلغین اور مشائخ کی ناقدری کی جا رہی ہے- جب کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان شخصیات اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا اور اس غلط فہمی کو دور کیا جاتا کہ عالم ہونے کے لیے مدرسہ کی سرٹیفکیٹ کی کوئی ضرورت ہے اور جب وہ، خواہ جس طرح بھی ہو، علوم ظاہری وباطنی سے آراستہ ہیں اور دعوت دین واقامت دین کے لیے شب وروز جہد مسلسل کرنے والے ہیں تو اب ان سے بہتر عالم اور کون ہو سکتا ہے لیکن دینی اقدار اور دینی شعور کے زوال کی یہ انتہا ہے کہ اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے عالم ہونے کے لیے ہر کسی سے مدرسے کی سند کا مطالبہ کیا جا رہا ہے- اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت اور کاملین کی صحبت میں بیٹھنے کی توفیق عطا فرمائے- (آمین)

وعظ ونصیحت، تقریر وخطابت، دعوت وتبلیغ، تحریر وصحافت، تحقیق وتعلیق اور افتا وقضا جیسے امور میں کس کے لیے کون سی لیاقت ضروری ہے اس کے لیے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے اور ماسبق میں جو گفتگو ہوئی اس سے بھی بہت سی باتیں واضح ہو جاتی ہیں لیکن متعلقہ میدانِ اختصاص میں گہرائی کی ضرورت کے بعد جو بات سب کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ واعظ ہو کہ ناصح، داعی ہو کہ خطیب، قلم کار ہو کہ صحافی، محقق ہو کہ حاشیہ نگار اور مفتی ہو کہ قاضی سب کو اساسیات دین اور اساسیات اہلِ سنت کا علم ہونا چاہیے- عقائد واصول اور ذات وصفات الٰہی کا ایسا یقین حاصل ہونا چاہیے کہ اس کے پیکر سے خشیت الٰہی کا جلوہ ظاہر ہوتا ہو اور دیکھنے والا دیکھ کر یہ کہہ سکے کہ یہ اصول وعقائد اس کی دل کی گہرائیوں میں اتر چکے ہیں، اور ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے اپنے میدان کے شہسوار تو ہوں لیکن ان کا ظاہر اس بات کی غمازی کر رہا ہو کہ یہ شخص ذات وصفات کی معرفت تو دور کی بات ہے اس کے وجود کا ہی منکر ہے- اور عصر حاضر میں جو کہ انفجار علم کا دور ہے، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ روایتی جمود کو توڑا جائے، فقہ وعلم، ذکر وحکمت جیسے الفاظ کو انہیں معنوں میں سمجھا جائے جن میں قرون اولیٰ کے لوگ سمجھا کرتے تھے اور ہر معاملہ میں اپنے اسلاف کی طرف پلٹ کر قرآن وحدیث وآثار صحابہ وتابعین وتبع تابعین سے بصیرت حاصل کر کے، مذہبی علم وفکر کے تسلسل کو آگے بڑھایا جائے اور کسی بھی حال میں مقاصد شریعت اور روح اسلامی کو پس پشت نہ جانے دیا جائے اور خالص خشک لفظی جمود سے آگے بڑھ کر سوچنے کی کوشش کی جائے کیوں کہ یہ دور مابعد جدیدیت کا دور ہے اور مابعد جدیدیت یہ ہے کہ پھر سے اپنے ماضی کی طرف پلٹ جایا جائے اور ایک بار پھر سے وہ مشہور قول ہمارے قلب وضمیر کو جھنجھوڑ رہا ہے کہ اس امت کے آخر کے لوگوں کو اسی سے کامیابی حاصل ہوگی جس سے قرن اول والوں کو حاصل ہوئی تھی- اب لوگ تیزی کے ساتھ قرآن وسنت کے مطالعہ کی طرف رجوع کر رہے ہیں اور مستقبل میں اس رجحان کے تیز تر ہونے کے روشن امکانات ہیں، اگرچہ اس رجحان سے کچھ لوگ فائدہ اٹھا کر عوام کو اسلاف سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن اس خطرے سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے

بقیہ صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں

اظہارِ خیالات

اس کالم میں آپ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور ملی کسی بھی مسئلہ پر اپنی فکر اور اپنے خیال کا برملا اظہار اور بے لاگ تبصرہ کرسکتے ہیں جو ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائے گا، واضح ہو کہ اس سلسلے میں آپ کی تحریر مختصر اور جامع ہونی چاہیے.................(ادارہ)

۲۰۱۱ء قائد انقلاب علامہ فضل حق خیرآبادی کا سال ہے!

محمد ارشاد عالم نعمانی
دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی-۲۵

محترمی! سلام مسنون......قائد انقلاب حضرت علامہ فضلِ حق خیرآبادی ہندوستان کے وہ عظیم سپوت ہیں جنہوں نے ہندوستان کو انگریزی سامراج کے ظلم واستبداد اور جبر وقہر سے آزاد کرانے کے لیے انقلاب ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا اور فتویٰ جہاد کے ذریعہ ہندوستانیوں کے اندر روح انقلاب پھونک دی جس کے نتیجے میں ۹۰ ہزار ہندوستانیوں نے دہلی میں جمع ہو کر انگریزی سامراج کے خلاف علم جہاد بلند کیا- گرچہ اس وقت انقلاب کی یہ تحریک بظاہر ناکام ہوگئی اور انگریز پورے طور سے ہندوستان پر قابض ہوگئے لیکن آزادی ہندوستان کی یہی چنگاری بالآخر ۱۹۴۷ء میں شعلہ جوالہ بن گئی اور ہندوستان غاصب برطانوی سامراج کے پنجے سے آزاد ہوگیا-

سوادِ اعظم اہلِ سنت وجماعت کے اس مذہبی ملی اور جماعتی قائد کی ہمہ گیر خدمات کا اب اعتراف کیا جانے لگا ہے- نئی نسل ان کے بے نظیر کارناموں سے واقف ہوتی جارہی ہے- برصغیر پاک وہند میں قائد انقلاب کو متعارف کرانے میں جن شخصیتوں کا خصوصی کردار ہے ان میں سب سے پہلا کام حضرت مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی، اسسٹنٹ لائبریرین، شعبۂ مخطوطات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا ہے، جنہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں علامہ کے قائدانہ کردار کو خود ان کی اہم تصنیف ''الثورۃ الھندیہ ''(باغی ہندوستان) کے آئینے میں مدلل پیش کیا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں مدینہ پریس بجنور سے مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا- واضح رہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد حضرت مولانا خیرالدین دہلوی علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد اور اہل سنت کے ایک ممتاز عالم تھے-

علامہ فضلِ حق خیرآبادی کے تعلق سے مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری لاہور کی ایک بڑی نمایاں خدمت یہ ہے کہ انہوں نے علامہ خیرآبادی کی مشہور کتاب تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت اول اپنے مکتبہ قادریہ لاہور سے ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء میں کی جس میں ترجمہ کے ساتھ ساتھ فارسی متن بھی ہے- ہندوستان میں صرف ترجمے کے ساتھ تحقیق الفتویٰ کو سب سے پہلے روضۃ المعارف خیرآباد اعظم گڑھ نے شائع کیا پھر المجمع الاسلامی مبارک پور اعظم گڑھ نے ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء میں شائع کیا- مولانا شرف قادری کی دوسری نمایاں خدمت یہ ہے کہ انہوں نے الثورۃ الھندیہ (باغی ہندوستان) تصنیف علامہ فضلِ حق خیرآبادی وترجمہ مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ قادریہ لاہور سے ہی ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء میں پھر ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء میں شائع کیا، جسے مترجم کی نظر ثانی اور جدید کتابت کے بعد المجمع الاسلامی مبارک پور نے ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء میں شائع کیا-

علامہ فضلِ حق خیرآبادی کے تعلق سے تیسری اہم شخصیت حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) کی ہے- انہوں نے ''فضلِ حق خیرآبادی اور سن ستاون'' کے نام سے نہایت علمی وتحقیقی کتاب تصنیف کی، جو پاکستان سے متعدد بار شائع ہوچکی ہے- قارئین کے لیے یہ خبر بھی باعث مسرت ہوگی کہ ہندوستان کی ایک خاتون محترمہ ڈاکٹر قمر النساء نے عربی زبان میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (انڈیا) سے اپنے عربی تحقیقی مقالہ العلامۃ فضل حق الخیرآبادی مع تحقیق کتابہ الثورۃ الہندیۃ پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے جسے مکتبہ قادریہ لاہور نے ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء میں شائع کیا اسی طرح

پاکستان کی ایک خاتون محترمہ ڈاکٹر سلمہ سہول نے علامہ خیرآبادی پر اردو زبان میں ایک اہم کتاب لکھی ہے جسے ممتاز پبلی کیشنز کراچی نے ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء میں شائع کیا- اسی طرح مولانا محمد احمد مصباحی فیض آبادی نے میسور یونی ورسٹی (کرناٹک) سے اردو میں علامہ خیرآبادی پر ریسرچ کیا اور اسے خود ہی مدرسہ اہل سنت ضیاء العلوم ٹانڈہ سے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا- اس کے علاوہ مولانا ممتاز احمد سدیدی پاکستان نے جامعہ ازہر مصر سے علامہ خیرآبادی کی عربی شاعری پر پی ایچ ڈی کی ہے اور مولانا ارشاد احمد ساحل سہسرامی نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے علامہ خیرآبادی کی عربی خدمات پر اپنا تحقیقی مقالہ جمع کیا ہے جو ہنوز تشنۂ اشاعت ہیں-

اس سلسلے میں چوتھی اہم شخصیت حضرت مولانا یٰسین اختر مصباحی، بانی و صدر دارالقلم، دہلی کی ہے جنہوں نے مختلف نوعیتوں سے قائد انقلاب علامہ فضل حق کی دینی و علمی اور سیاسی خدمات سے قوم کو روشناس کرایا- اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جب آپ (۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۲ء) جامعہ اشرفیہ مبارک پور کی تدریسی خدمات سے وابستہ تھے تو آپ نے باغی ہندوستان کا مطالعہ کیا اور بعد مطالعہ انہیں تصحیح و نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی سے تقریباً ۱۹۸۰ء میں رابطہ کیا اور پھر مسلسل مراسلات کے ذریعے انہیں اس کی تصحیح و نظر ثانی پر آمادہ کیا اور اسے اپنے تصنیفی و اشاعتی ادارہ المجمع الاسلامی کے ذریعہ طباعت و اشاعت کا یقین دلایا- مولانا شیروانی نے آپ کی تحریک پر تصحیح و نظر ثانی فرمائی اور اسے المجمع الاسلامی مبارک پور کے سپرد کیا جو مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی موجودہ صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی نگرانی میں المجمع الاسلامی مبارک پور کے زیر اہتمام ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء میں شائع ہوا- مولانا شیروانی، مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب کے تحریک و اصرار کا ان لفظوں میں اعتراف و شکریہ ادا کرتے ہیں:

''میں بصمیم قلب محترم مولانا محمد یٰسین اختر مصباحی رکن المجمع الاسلامی مبارک پور ک اعظم گڑھ شکر گزار ہوں کہ موصوف کے پیہم اصرار اور مسلسل تقاضوں نے نظر ثانی کا کام انجام دلایا اور چوتھے ایڈیشن کی اشاعت کا سروسامان کیا-''

(ص ۱۴، باغی ہندوستان مطبوعہ المجمع الاسلامی مبارک پور طبع چہارم ۱۹۸۵ء)

اور پھر یہی تصحیح شدہ نسخہ مطبوعہ المجمع الاسلامی مبارک پور، پورے ہندوستان میں عام ہوا اور لوگ قائد انقلاب کے علمی و سیاسی احوال سے واقف ہوئے- بعد میں اہل قلم اور صاحبان فکر و بصیرت نے اس اولین ماخذ کے حوالے سے قائد انقلاب کی علمی و سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مقالات اور کتابیں تصنیف کیں اور علمی دنیا میں ان کا خصوصی تعارف کرایا گیا-

مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب نے دوسرا اہم کام اس وقت کیا جب ۱۹۹۷ء میں آزادی ہند کا پچاس سالہ جشن آزادی (از ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۷ء) منایا جا رہا تھا- آپ آنکھ کے آپریشن کے سلسلے میں ممبئی میں مقیم تھے- اس موقع سے علامہ فضل حق خیرآبادی کے ساتھ دیگر ۹ قائدین انقلاب کی خدمات کو مختصراً املا کرایا اور رضا اکیڈمی ممبئی کے پلیٹ فارم سے اردو و ہندی میں اس کی اشاعت اور مفت تقسیم بھی ہوئی- ان ہی کی سرپرستی میں ممبئی حج ہاؤس میں جلسۂ خراج عقیدت قائدین جنگ آزادی منعقد ہوا جس کی رپورٹ اردو اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کی-

اس سلسلے میں تیسرا اہم کام آپ نے یہ کیا کہ ۲۰۰۷ء میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کی مناسبت سے فاضلانہ انداز میں آپ نے چار اہم کتابیں لکھیں جن کے ذریعے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں علمائے اہل سنت کے بنیادی کردار کو ملک گیر سطح پر متعارف کرایا اور پہلی بار پوری جماعت اہل سنت کی طرف سے اس فرض کفایہ کو ادا کیا، خصوصیت کے ساتھ علامہ فضل حق خیرآبادی کے کردار کو ایک مستقل تصنیف'' قائد جنگ آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی'' کے نام سے قلم بند کیا اور اس کے ذریعہ اپنے اور بیگانے ہر ایک سے حقیقت کا اعتراف کرایا-

۱۸۵۷ء کے موضوع پر اس سے قبل یک طرفہ لکھنے کا رواج تھا- فرضی اور من گھڑت تاریخ نویسی کا آپ نے اپنی تصانیف کے ذریعے دستاویزی حیثیت سے جس طرح پردہ چاک کیا ہے اور عام لوگوں کو حقیقت کا شفاف آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے وہ یقیناً پوری جماعت کی طرف سے قابل ستائش ہے-

اس سلسلے کا چوتھا اور اہم کام انہوں نے اب شروع کیا ہے- ۲۰۱۱ء میں علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی اگست ۱۸۶۱ء بمقام جزیرۂ

انڈمان) کے وصال کو ڈیڑھ سو سال پورے ہونے جارہے ہیں، اس مناسبت سے انہوں نے پورے سال (از جنوری تا دسمبر ۲۰۱۱ء) جشن قاید انقلاب منانے کا منصوبہ بند فیصلہ کیا ہے- اس سلسلے میں اہم قدم اٹھاتے ہوئے ایک بلند پایہ تصنیف جو علامہ فضل حق خیرآبادی کے سیاسی، ملی اور قومی کردار وخدمات پر مشتمل ہے ۱۳۸ صفحات میں اپنے تصنیفی واشاعتی ادارہ دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی سے اسی ماہ یعنی دسمبر ۲۰۱۰ء میں شائع کیا ہے-

ان سے گفتگو کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ سال ۲۰۱۱ء کے مختلف مہینوں میں ہندوستان کے مرکزی شہروں میں جشن قاید انقلاب کا نہ صرف ارادہ رکھتے ہیں بلکہ اس تعلق سے پانچ اہم شہروں میں انہوں نے آل انڈیا جشن قائد انقلاب کا مکمل منصوبہ اور پروگرام بھی بنالیا ہے -ضرورت ہے کہ حضرت مولانا لیسین اختر مصباحی صاحب کی اس انقلاب آفریں تحریک کا خیر مقدم کیا جائے اور جلسہ وسیمینار، تحریر وخطابت اور فکر وصحافت ہر سطح سے اس کو کامیاب بنایا جائے- ان شاء اللہ اس کے ذریعے اہلِ سنت کا قومی وملی وقار بلند ہوگا اور سیاسی طور پر بھی اسے وہ مقام ملے گا جو اب تک نہیں مل سکا ہے- علما ودانشوران اور ارباب قلم سے یہ بھی گزارش ہے کہ قایدِ انقلاب کی علمی وسیاسی خدمات کے نئے پہلو کو اپنی فکر وتحقیق کے ذریعے سامنے لائیں- اس سلسلے میں مولانا اسید الحق قادری کا مضمون "فضل حق، فضل رسول اور آزردہ" جو ابھی جام نور کے شمارہ دسمبر ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا ہے علمی نوعیت کا ہونے کے ساتھ بالکل نئے گوشے پر مبنی ہے جس کے لیے ہم مولانا کو بصمیم قلب مبارک باد دیتے ہیں-

اخیر میں سنی رسائل وجرائد کے ذمہ داران سے بھی التماس ہے کہ وہ اپنے ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی وقیع مضمون علامہ فضل حق خیرآبادی کی حیات وخدمات پر شائع کرتے رہیں اور ۲۰۱۱ء میں اپنے رسالے کا گراں قدر نمبر یا کم از کم ایک خصوصی شمارہ قایدِ انقلاب علامہ فضل حق خیرآبادی پر ضرور نکالیں-

علامه ارشد القادری کی راجدهانی : جهار کهنڈ

محمد دلشاد احمد
متعلم: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

جھارکھنڈ ملک ہندوستان کا ایک صوبہ ہے جو ۲۰۰۰ء میں بہار سے کٹ کر بنا ہے، یہ صوبہ بہار، بنگال، چھتیس گڑھ اور اڑیسہ کے وسط میں واقع ہے، یہ صوبہ کثرت سے پہاڑ، ندی نالے اور جنگلات اپنے دامن میں لیے ہوا ہے، لیکن جھارکھنڈ الگ ہونے کے بعد دس سال گزر جانے کے بعد بھی آج تک وہاں کوئی مضبوط حکومت نہ بن پائی جو نظم ونسق برقرار رکھے اور قوم کو بھرپور فائدہ پہنچا سکے- اس ترقی یافتہ دور میں یہ صوبہ ترقی کے بجائے تنزلی کی طرف گامزن ہے- دینی تہذیب وتمدن اور تعلیم وتعلم کی حالت بھی قابلِ افسوس ہے-

دینی تہذیب سے یہ صوبہ ابتدا ہی سے دور رہا ہے- وہاں مسلمان تھے مگر صرف کلمہ پڑھنے والے تھے، اسلام کی صحیح تعلیمات سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے وہ ہندوانہ رسم ورواج میں پلے بڑھے اور وہی رسم ورواج ان کے اندر باقی رہی- آج بھی علما ومدارس اور جلسہ وجلوس کی کثرت کے باوجود بہت سی جگہوں میں وہی آج بھی پرانی رسوم باقی ہیں- علما کثیر تعداد میں موجود تو ہیں لیکن ان میں اکثریت ان کی ہے جن کے دلوں میں ایمانی جذبہ نہیں ہے، خدمت دین کا شوق نہیں ہے، بلکہ دین خدا کی تبلیغ واشاعت کی جگہ دولت کمانے کی حرص اور روپے لوٹنے کی ہوس ہے- وہ اپنی تقریروں میں اصلاحی گفتگو نہیں کرتے- وہ کوئی ایسی دینی بات جس سے عوام کو کسی طرح کی تکلیف یا ناگواری ہو یہ سوچ کر نہیں کرتے کہ ان کی عزت گھٹ جائے گی اور وہ افراد جن کے اندر خدمت دین کا جذبہ کارفرما ہے ان کے اخلاق وکردار میں کمی ہے، طریقۂ تبلیغ میں کمی ہے، وہ اگر برائیوں کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی حمایت نہیں ہوتی بلکہ ان کی مخالفت ہونے لگتی ہے۔ جس کی وجہ سے کما حقہ فائدہ نہیں ہوتا-

یہاں کے عوام لاکھوں روپے خرچ کر کے تزک واحتشام اور دھوم دھام سے بڑے بڑے جلسے کراتے ہیں، لیکن ان میں کوئی ایمانی جذبہ موجزن نہیں ہوتا بلکہ اس سے زیادہ شہرت ونا موری ہی ہاتھ لگتی ہے- ان جلسوں کے انعقاد میں خرچ بہت زیادہ، فائدہ بہت کم ہوتا ہے، ان جلسوں

میں تقریر کرنے والے مقررین کے اندر بھی دین کی دعوت اور تبلیغ اسلام کے جذبے کی جگہ حرص وطمع کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے- وہ واقعات بیان کر کے، گلا پھاڑ پھاڑ کر، تقریر میں شعلہ بیانی پیدا کر کے نعرہ لگوا لیتے ہیں اور قوم کو بدعملی کے دلدل میں چھوڑ جاتے ہیں- جب ایک بستی والے جلسہ کراتے ہیں تو دوسری بستی والے بھی جوش میں آتے ہیں کہ ہم اس سے شاندار جلسہ کرائیں گے اس سے زیادہ روپے خرچ کریں گے- آج یہ جلسے میلے اور فیشن میں تبدیل ہو گئے ہیں، ان میں بے سود اخراجات کا کسی کو احساس ہے اور نہ ہی تعلیم و تربیت سے دوری کا احساس ہے- ضرورت ہے کہ آج کے مسلمانوں کے اندر ایمان وعمل کی روح پھونکی جائے اور ان کو خواب غفلت سے بیدار کیا جائے-

شادیوں میں بھی برائیوں کی کمی نہیں ہے، ہندوانہ رسم ورواج کے ختم ہو جانے کے بعد بھی کچھ جگہوں (دیہی علاقوں) میں ان پر پابندی سے عمل کیا جاتا ہے- جہیز میں خرید وفروخت کی طرح مول بھاؤ کیا جاتا ہے، مزید یہ کہ گانا بجانا، بی، ڈی دیکھنا اور تصویر کشی کا عمل ضروری ہوتا جارہا ہے- عورتیں پردے کا بالکل اہتمام نہیں کرتیں بس شہروں میں دو چار عورتیں نقاب لگاتی نظر آجاتی ہیں- ان برائیوں سے کوئی روکنے والا نہیں، اس تعلق سے بات کرنے والوں کی تعداد بمشکل ۵رفیصد ہے لیکن ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں-

یہ صوبہ قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان کے یہاں تشریف لانے سے قبل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، انہوں نے ہی علم کا چراغ جلایا، علم سے محروم اس خطے میں مدارس کا جال پھیلایا- آپ نے مدرسے قائم کر کے، تبلیغ کر کے اور بے پناہ محنت ومشقت کر کے اس تاریک وادی میں علم کا نور پھیلایا اور لوگوں تک اسلام کی سچی تعلیمات پہنچائی- علما پیدا کیے- اس مرد مجاہد کی ناچیز کیا تعریف کر سکتا ہے، جس نے اپنی تبلیغی اور قلمی خدمات سے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا- دین اسلام کا یہ عظیم پاسبان آج مدرسہ فیض العلوم جمشید پور کے سامنے آرام فرما ہے- آپ کے سفر آخرت کے بعد آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر مولانا غلام زرقانی صاحب (مقیم امریکہ) مدرسہ فیض العلوم کی سربراہی فرما رہے ہیں اور جھارکھنڈ کی پیاسی انسانیت کو اپنے علمی فیضان سے سیراب کر رہے ہیں- پھر نبیرۂ قائد اہل سنت حضرت مولانا خوشتر نورانی صاحب نے ”جام نور“ کو (جسے علامہ صاحب نے اپنی زندگی میں جاری کیا تھا اور جو تین چار سال کے بعد بند ہو گیا تھا) نئی جان دے دی اور آپ کے منصوبے کو اس طرح بروئے کار لائے کہ آج ماہ نامہ جام نور سب سے زیادہ مقبول عام وخاص رسالہ ہو گیا ہے، جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا- اس رسالہ جام نور سے جھارکھنڈ کے لوگ خاص طور سے امید لگائے ہوئے ہیں کہ یہ رسالہ مسلک اہل سنت کی اور علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے مشن کی خدمت کرتا رہے گا-

اسی مرد خدا (علامہ ارشد القادری) کا فیضان ہے کہ آج جھارکھنڈ میں بے شمار علما اور مدرسے نظر آرہے ہیں- لیکن ان میں اکثر کی حالت آج بہتر نہیں- ان مدرسوں کو علما ہی قوم سے چندہ کر کے چلاتے ہیں، نہ ان پر حکومت کی توجہ ہے نہ حمایت- ان میں اکثر مدرسوں کی حالت یہ ہے کہ نہ ان میں باصلاحیت اساتذہ ہیں، نہ نظام تعلیم درست ہے اور نہ ہی یہاں کے طلبہ کامیاب ہیں- بس ایک دو مدرسے ہیں جہاں صحیح تعلیم ہوتی ہے- جہاں تک بات ہے عصری تعلیم کی تو اس میں بھی مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے- حکومت کی امداد سے چلنے والے ان اسکولوں اور کالجوں میں باصلاحیت اساتذہ نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ کو کسی فن میں مہارت نہیں ہو پاتی ہے اور نہ ہی وہ دنیا کی دوڑ میں آگے بڑھ پاتے ہیں-

یہاں تعلیم کا نہ ماحول ہے نہ جذبہ- جن بچوں کو تعلیم گاہوں میں ہونا چاہیے وہ مزدوری اور چرواہی کرتے نظر آتے ہیں- پھر جب ان میں کچھ سوجھ بوجھ ہوتی ہے تو روپے کمانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ وطن سے دور نکل جاتے ہیں، جب دو چار روپے کما لیتے ہیں تو ملٹی میڈیا موبائل اور سی ڈی خریدتے ہیں پھر تو تصویر کشی، گانا سننے اور فلم دیکھنے میں ہی وقت گزرنے لگتا ہے- آگے چل کر نتیجہ بہت بھیانک اور خطرناک ثابت ہوتا ہے- پھر جب کوئی اصلاحی کوشش ہوتی ہے تو ان کے اخلاق واذہان بگڑ چکے ہوتے ہیں اور تمام کوششیں رائگاں ہو جاتی ہیں- ادھر بدعقیدگی تیزی سے قدم بڑھا رہی ہے کیوں کہ لوگ سنی پیشواؤں اور مولویوں سے پہلے ہی بگڑے ہوتے ہیں جس کے سبب آسانی سے بدعقیدوں کے فریب میں آجاتے ہیں-

آج بھی اگر علمائے دین اور بیدار مغز، کچھ ذمہ دار عوام چاہیں تو مخلصانہ جدوجہد کر کے ماحول میں سدھار پیدا کر سکتے ہیں- کچھ خرابیاں جاہل

وبدعمل پیروں کی وجہ سے بھی پروان چڑھ رہی ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے بھی محنت کی ضرورت ہے اور اس کے لیے علما ہی کو آگے آنا ہوگا-
علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے قائم کردہ مدرسہ فیض العلوم دھنکیڈیہ جمشید پور کا فیضان پورے جھارکھنڈ پر چھایا ہوا ہے، یہاں زیادہ تر علما فیضی ہی ہیں، اب کچھ مصباحی بھی پیدا ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے مستقبل میں کچھ مزید روشنی کی امید وابستہ ہو چکی ہے-

صوفیہ ہی امن واسلام کا سویرا لاسکتے ہیں

سیدعینین علی حق چشتی
باڑہ ہندوراو، دہلی-۶

یوں تو ہندوستان میں اسلام کی آمد کافی پہلے ہو چکی تھی، محمد بن قاسم اور دیگر تجار عرب ہندوستان آچکے تھے اور تبلیغ دین کا بیش بہا کارنامہ بھی انجام دیا تھا ان کی خدمات کا ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا- ان کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ بہر حال یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی مزاج وطبیعت کو سمجھنے اور اس کے ادراک میں جو طبقہ سب سے کامیاب ہوا وہ بلاشبہ صوفیہ کا طبقہ تھا اور اس میں بھی چشتی بزرگوں کو اہمیت حاصل ہے، جنہوں نے یقینی طور پر اسلام کو ''الاسلام یسر لاعسر'' بنا کر پیش کیا اور اپنی ذات کو بے ضرر ثابت کرنے میں وہ حد درجہ کامیاب بھی ہوئے- انہوں نے انسانیت کی تفہیم کو اصل سرمایہ حیات قرار دیتے ہوئے عوام وخواص کے دلوں پر اپنی حکومت قائم کی اور تخت وتاج کو آنکھ نہیں لگایا- یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بزرگان چشتیہ یکے بعد دیگرے آج بھی عوام الناس کے دلوں میں موجود ہیں- حضرت خواجہ غریب نواز، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت خواجہ بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت خواجہ کلیم اللہ شاہ جہان آبادی، حضرت مولانا فخر الدین چراغ چشت یکساں طور پر مقبول ومؤثر ہوئے ہیں-

ایسا بھی نہیں ہے کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی ہندوستان آمد ہوئی تو ہندوستانی زمین تبلیغ واشاعت اسلام کے لیے مسطح اور ہموار تھی اور انہوں نے بلا کسی جدوجہد کے کلمہ اسلام پڑھانا شروع کر دیا- اس کے برعکس کتابوں کے اوراق ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ خواجہ کو حد درجہ جدوجہد کرنی پڑی- انہوں نے وضو کرنا چاہا تو انہیں وضو سے روک دیا گیا- نماز ادا کرنی چاہی تو اس سے بھی منع کیا گیا- جادوگروں کا سہارا لیا گیا- طرح طرح سے انہیں پریشان کیا گیا- لیکن انہوں نے باشندگان ہندوستان کے عذر کو عذر لنگ محسوس نہیں کیا اور وہ اپنے مشن میں ثابت قدم رہے- اپنے پیغام محبت کو عام کیا- بھید بھاؤ سے کام نہیں لیا، نہ ہی کسی پر جبر کیا- ''ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ'' کو نمونہ کے طور پر استعمال کرتے رہے- پہلے اپنے اعمال وافعال سے عوام الناس کو متاثر کیا پھر اسلام کے قوانین کو ان کے ذہن ودماغ میں بتدریج بسایا- احکامات اسلام کو مانوس بنا کر پیش کیا- حضرت خواجہ نے فرمایا ''انسان کو دریا کی سی سخاوت، زمین کی سی تواضع اور سورج کی سی شفقت اختیار کرنی چاہیے-'' یہی پیار کے دو بول تھے جس نے ہندوستانیوں کی زندگیاں بدل دیں- انہوں نے ستی کے رواج سے خود کو پاک کر لیا- گناہ کو گناہ سمجھنے لگے- ان بزرگوں کے خلاف دلوں میں جو کدورتیں پائی جاتی تھیں وہ بتدریج ختم ہوتی گئیں بزرگوں کی نفرت سے دل پاک ہو گئے اور آج ہمارے سامنے نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار تخت وتاج کے مالک سلاطین امت ہندوستانیوں کے اذہان سے محو ہو گئے اور خود ان کی کارستانیوں اور غیر مصلحت پسندانہ رویوں کی وجہ سے وہ لائق مذمت ٹھہرے مگر اب بھی ہندوستان میں بلا تفریق مذہب وملت بزرگوں کو چاہنے والی اکثریت موجود ہے-

ان بزرگوں کے بے شمار اعمال وافعال آج بھی ہندوستان میں رائج اور مقبول ہیں جن میں ایک مجلس سماع یا صوفیانہ قوالی ہے- آیئے جانتے ہیں مجلس سماع یا صوفیانہ قوالی کی حقیقت واہمیت کیا ہے- ہندوستان مین سب سے پہلے سماع یا صوفیانہ قوالی کو چشتی بزرگوں نے رائج کیا- مجلس سماع کے انعقاد کے بے شمار مقاصد کے حصول کے ساتھ یہ بھی مقصد مسلم تھا کہ ہندوستانی بھجن اور کیرتن کے عادی رہے ہیں- لہٰذا جس طرح عرب میں اسلام کے ظہور کے ساتھ شراب کی حرمت کا اعلان نہیں کیا گیا، اسی طرح یہاں بھی ان کے اعمال کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے بھجن اور کیرتن کا قبلہ ماسوا اللہ سے اللہ کی طرف موڑ دیا- مزامیر میں تخفیف کی آداب وشرائط نافذ کیے- اس کے انعقاد کا مقصد رضائے الٰہی قرار دیا، اسلام کے

پاور ہاؤس حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال سے کسب فیض کیا۔روشنی حاصل کی۔ہجرت کے واقعہ کو اپنے لیے نظیر بنایا کہ ہمارا عمل اسلام مخالف بھی نہ ہو اور ہندوستانی مزاج و آہنگ کو زک بھی نہ پہنچائے۔

جواز سماع کے بے شمار دلائل میں بزرگان دین نے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ پہنچے تو مدینہ کے بچے بچیاں اپنی چھتوں پر بے قراری کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منتظر تھے۔جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی نظر پڑی تو وہ جذبہ شوق میں دف بجا بجا کر استقبالیہ کلام پڑھ رہے تھے۔

طلع البدر علینا	من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا	ما دعا للہ داع
ایہا المبعوث فینا	جئت بالامر المطاع

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دف پر اس کلام کو ملاحظہ فرمایا۔ان بچے بچیوں کو روکا نہیں۔حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تین قسمیں ہیں۔جس کا حکم فرمایا یا کہا اسے حدیث قولی کہتے ہیں اور جسے کر کے دکھایا اسے حدیث عملی کہتے ہیں اور جسے نہ کیا نہ کہا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صحابہ کرام نے کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو اس سے باز رہنے کی ہدایت نہیں فرمائی اسے حدیث تقریری کہتے ہیں۔مجلس سماع بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور حدیث تقریری ثابت ہے۔

سماع کو سب سے زیادہ ہندوستان میں رواج ملا،چشتی بزرگوں نے اسے بعض شرائط کے ساتھ عام کیا۔روحانی غذا کے حصول کا ذریعہ بنایا۔خانقاہوں نے ایسے شعرا پیدا کیے جنہوں نے خالص ہندوی زبان میں شاعری کی۔خسرو،بلھے شاہ،بابا فرید گنج شکر،بیدم وارثی وغیرہ کے نام ناقابل فراموش ہیں۔انہوں نے عشق حقیقی میں رنگی شاعری کی۔پھر وہ شاعری مجالس سماع یا صوفیانہ قوالیوں میں پیش کی گئی جس سے نہ صرف عشق حقیقی کی چنگاریاں شعلہ بنیں بلکہ قومی یکجہتی کی فضا بھی قائم ہوئی۔انسانوں کو مذہبی منافرت سے نجات ملی۔انسان کو انسانیت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ہر ہندوستانی بھائی بھائی ہو گیا۔بزرگوں کی بارگاہوں سے سب کے مسائل حل کیے جانے لگے۔

ہندوستانی تاریخ کو جب ہم کتابوں کے اوراق پر دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑا ہی افسوس ہوتا ہے کہ جب سے خانقاہوں میں زوال و انحطاط کی بساط پھیلنے لگی تبھی سے ہندوستان میں فرقہ واریت،تشدد،نسل پرستی اور انتہا پسندی پھیلنی شروع ہوئی۔خانقاہوں میں پیغام الفت و محبت عام کرنے والے نہ رہے اور ہندوستان میں اختلاف و انتشار کی بیج بونے والے بے شمار منافقین آگئے،جنھوں نے نہ صرف ہمیں اپنا غلام بنایا بلکہ ہندو مسلم ایکتا کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔

آج بھی خانقاہیں احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔وہ اسلحے جن سے اسلامی پیغامات عام کیے جا سکتے ہیں وہ خانقاہوں کے پاس موجود ہیں اور وہی امن و امان کی فضا بحال کر سکتے ہیں۔آج بھی ہندوستانیوں کے دلوں میں اسلام کے تئیں نرم گوشہ موجود ہے،شرط یہ ہے کہ انانیت سے چور کوئی لہجہ انہیں نہیں چاہیے۔کوئی بوریہ نشین چاہیے جو انہیں سمجھ سکے اور یہ ان کے سامنے اپنا درد دل رکھ سکیں۔پورے ہندوستانی آج پریشان حال ہیں۔یہ غریب ہیں انہیں کوئی غریب نواز چاہیے۔

اپنے دور میں گرونانک جی نے حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت ابراہیم فرید ثانی سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ان سے بابا فرید کے ۱۲۵ دوہے حاصل کر کے انہیں اپنی مذہبی کتاب گرو گرنتھ میں شامل کیا تھا اور آج بھی سکھوں کے یہاں جس انداز میں کیرتن کا رواج ہے اور اس میں جس انداز کے کلام پڑھے جاتے ہیں وہ سب مجلس سماع سے مستفاد ہیں۔ہندوستانیوں نے بزرگوں کے بہت سارے اعمال کو رواج دیا ان میں ایک لنگر کا بھی رواج ہے،جسے سکھ قوم نے لنگر ہی کہا۔ہمارے ہندو بھائیوں نے اسے بھنڈارے کا نام دیا۔آج بھی ہندوستان میں بے شمار جوگی جے پال اور گرونانک موجود ہیں حرماں نصیبی یہ ہے کہ کوئی معین الدین،قطب الدین،فریدالدین،نظام الدین نہیں ہے۔

گزشتہ ۷/ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو جشن دلی کے تحت چاندنی چوک کے ٹاؤن ہال میں قوالی کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں زیادہ تعداد برادران وطن کی تھی۔ جب عتیق حسین خاں بندہ نوازی نے عربی و فارسی کلام شروع کیا تو میں یہ دیکھ کر محو حیرت رہ گیا کہ عربی و فارسی نہ سمجھنے کے باوجود برادران وطن کی اکثریت وجد کی کیفیت میں تھی۔ بعض جوان تک فارسی کے کلام

نمی دانم چہ آخر چوں دم دیدار می رقصم   مگر نازم بایں ذوقے کہ پیش یار می رقصم

پر جھوم رہے تھے اور اس کا ترجمہ معلوم کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اطلاعاً یہ بھی عرض ہے کہ کوئی کلام اس پروگرام میں ایسا نہیں پیش کیا گیا جس میں فلمی بول ہوں یا فلمی گانے سے متاثر ہو کر وہ لکھا گیا ہو۔ زیادہ تر کلام مذہبی نوعیت کے پڑھے گئے اور مجمع اخیر تک جوں کا توں نکا رہا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیانہ قوالی آج بھی قومی یکجہتی اور امن و امان کی بحالی کے لیے موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ جام نور کے گزشتہ شمارہ میں ڈاکٹر مینا کشی کھنہ کا انٹرویو بھی میری ان تابوں کی توثیق کرتا ہے، تصوف پر اتنی گہری نظر خانقاہی شہزادوں کی بھی کم ہی ہوا کرتی ہے۔ ان کا انٹرویو ایک نئی صبح کا اشاریہ ہے کہ نئی نسل فرقہ واریت سے تنگ آ گئی ہے۔ اور روحانی سکون کی متلاشی ہے۔ پوری دنیا میں تصوف پر کام ہو رہا ہے اور نئی نسل اس کی جانب متوجہ ہو رہی ہے اور وہاں اسے سکون بھی میسر ہو رہا ہے۔ دوسری جانب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جہان خسرو اور گلستان حضرت نظام الدین اولیا کا اضافہ بھی خوش آئند قدم ہے، وہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں حضرت خسرو پر یادگاری خطبہ اور حضرت داتا گنج بخش پر سہ روزہ سمینار کا انعقاد اور طلبہ و طالبات کا ازدحام بھی بے معنی نہیں ہے۔ انسان عین فطرت پر پیدا کیا گیا ہے اور آج آلائشوں کے ڈھیر میں دب کر کراہ رہا ہے، ایسے میں اسے صوفیہ اور ان کے اعمال ہی سکون حقیقی سے آشنا کر سکتے ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر کھنہ سے انٹرویو کے لیے ان کا انتخاب قابل صد ستائش ہے، آپ نے عملاً یہ ثابت کر دکھایا ہے اور خانقاہیوں کو چیلنج کیا ہے کہ آپ نے اپنے فرائض منصبی سے خود کو الگ کر لیا تو کیا ہوا؟ بزرگوں کے ملفوظات و تصانیف اور ان کے اعمال اپنا کام آج بھی کر رہے ہیں۔ دین اللہ کی تبلیغ و اشاعت کبھی رجال کار کرتے ہیں اور کبھی ان کے اعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کھنہ کا ایک ایک لفظ دل و نگاہ میں جگہ دینے اور ان سے عبرت لینے کے لائق ہے۔

بے وجہ مخالفت کے جھونکے کبھی دیر پا نہیں ہوسکتے

محمد ابرار رضا مصباحی
رگھوناتھ پور، بارسوئی کٹیہار (بہار)

گرامی قدر جناب مولانا خوشتر نورانی صاحب! سلام مسنون...... آپ کا بے خود کر دینے والا انورانی جام بہزار شوق و رغبت ۲۰۰۶ء سے نوش کرتا آ رہا ہوں، ہر جام لطف و مزہ سے پر ہو کر نکہت فشاں اور جلوہ کناں ہوتا ہے جس سے روح کو تازگی اور قلب کو تابندگی حاصل ہوتی ہے۔

عرصۂ دراز سے یہ سوچ رہا تھا کہ جام نور کو ادبی و صحافتی عروج اور نمایاں کارناموں پر خلوص دل سے مبارک باد پیش کروں لیکن احساس کمتری اور قصور خامہ فرسائی کی وجہ سے جذبات و خیالات کے اظہار کی ہمت نہ کر سکا۔ آخر کار فرط جذبات کی وجہ سے جب صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو تسکین قلب اور جذبات کو فرو کرنے کے لیے یہ ناقص و بے مایہ تحریر آپ تک پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ توقع ہے کہ خیالات و احساسات کی قدر کر کے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جام نور امت مسلمہ کی شکستہ روح کو طاقت ور اور مضبوط تر بنانے کا ایک اہم علمی و فکری آلہ ہے۔ جس کے ذریعے ملت کی ضروریات سے ناآشنا اور خوابیدہ افراد کو بیدار کر کے انہیں اپنی زبوں حالی اور پس ماندگی کا احساس دلاتا ہے اور صحیح فکر و عمل کی دعوت دیتا ہے اور یہ کافی حد تک اپنے مقصد کی حصول یابی میں کامیاب و کامراں بھی ہے جو مستقبل کی مستحکم اور پائیدار تعمیر و توسیع کے لیے ایک خوش آئند اور ہمت افزا قدم ہے نیز ہزار ہا مخالفتوں کو بالائے طاق اور پس پشت ڈال کر خاموشی کے ساتھ کوشاں اور رواں دواں نظر آتا ہے۔ جام نور متقضیات زمانہ کے لحاظ سے ایک منفرد المثال اور معلومات افزا رسالہ ہے۔ اس کے علمی و فکری اور تحقیقی مضامین و مشمولات جدید اسلوب اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں جو دینی و مذہبی ہونے کے علاوہ ملکی، سیاسی، سماجی اور دیگر حیرت انگیز معلومات پر بھی مشتمل

ہوتے ہیں جو بہت ہی بصیرت افروز، جامع اور لائق مطالعہ ہوتے ہیں- آپ کا مستقل کالم "تحریری مباحثہ" میرا پسندیدہ اور محبوب ترین کالم ہے کیوں کہ یہ جدید افکار و نظریات سے روشناس کراتا ہے اور مختلف فیہ مسائل کو زیر بحث لا کر علم برداران علوم شریعت، دانشوران ملک و ملت اور اصحاب فکر و بصیرت کی قیمتی آرا کے ذریعے حل کراتا ہے اور ان کے مثبت و منفی پہلوؤں سے آگاہ اور واقف کراتا ہے، جس سے نیاذ ہن، صحیح شعور، اعلیٰ فکر اور موجودہ دور کے طریقۂ کار کا علم ہوتا ہے-

نومبر کا تازہ شمارہ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے- تحریری مباحثہ کے کالم میں ایک اہم عنوان "قومی اور ملی مسائل میں اہل سنت کی نمائندگی کیسے ہو؟" قائم فرمایا ہے- اس میں دو اہم اور سرکردہ شخصیات کی آفاقی فکر اور ناصحانہ زرنگاری اور ایک فاضل نوجوان کی نئی فکر کے ذریعے امت مسلمہ کو غفلت پرستی اور تساہل پسندی سے نکالنے کا حکیمانہ عمل اور مفید اقدام ہے- علاوہ ازیں آپ کا اداریہ ان میں ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتا ہے لایعنی چیزوں سے قطع نظر حقائق بیانی پر زیادہ مبنی ہوتا ہے-

نومبر کے تازہ شمارے میں آپ نے انہی حقائق بیانی اور جرأت و بے باکی کا ثبوت دیا ہے، مارہرہ مقدسہ میں منعقدہ "فکر و تدبیر کانفرنس" کے بارے میں کچھ لوگوں میں بدگمانی راہ پا گئی تھی اور طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو کر توہمات کی دنیا میں زندگی بسر کرنے لگے تھے اور اہل مارہرہ مطہرہ کے خلاف بدگوئی کا ایک ناقابل تسلیم محاذ قائم کیے ہوئے تھے- آپ نے بروقت موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تحریر کا عنوان "فکر و تدبیر کانفرنس کی تین سالہ کارکردگی" منتخب فرمایا جس میں کانفرنس کے عزائم و مقاصد کو واضح کر کے حقیقت حال سے آگاہ کیا اور نادانوں اور بد اندیشوں کو بدگوئی سے بچا کر حقانیت و صداقت کی طرف ان کی رہبری و رہنمائی فرمائی-

بہر حال اس قسم کے اور بھی شواہد و دلائل ہیں جو اس بات پر دال ہیں کہ وقت کے سلگتے ہوئے مسائل اور حالات کی طرف توجہ دلانے اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ ان کو حل کرنے کی پہلی پیش رفت جام نور کی طرف سے ہوتی ہے جن کے ثمر بار نتائج برآمد ہوتے ہیں-

اخیر میں یہ عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ جام نور کے لیے ترقی کے امکانات کو سہل تر فرمائے- رفتار ترقی کو فزوں تر کرے، مخالفین و بداندیشوں کو ہدایت نصیب فرمائے اور پوری ادارتی جماعت کو مزید دین و ملت کی خدمات کا وافر جذبہ عطا فرمائے- آمین!

خانقاہوں کو صاحبان علم کی ضرورت ہے

خواجہ ساجد عالم مصباحی
استاذ: مدرسہ لطیفیہ، رحمٰن پور، بارسوئی، کٹیہار (بہار)

مولانا خوشتر نورانی علیگ حفظہ اللہ! سلام مسنون...... بکری مولانا ذیشان احمد مصباحی صاحب زبان و ادب، اسلوب بیان و طرز اظہار کے ساتھ ساتھ اب فکر و شعور کے لحاظ سے بھی خاصا پختہ کار و دیدہ ور ہو چکے ہیں- یہ تو کل کی بات ہے کہ جب آنجناب مراسلوں کی راہ سے جام نور کی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور نو آموزگان میں ایک خوش گوار اثر چھوڑ جایا کرتے تھے- سمند شوق کو مہمیز لگاتے گئے، آتش ذوق کو ہوا دیتے گئے اور یہاں تک پہنچے- شستہ و شگفتہ اور خوب صورت و دلکش پیرائے میں لکھنا زیادہ بڑی بات نہیں، کسی صاحب نظر، ژرف نگاہ و عالی دماغ انسان کی صفتوں سے لیس ہو کر فکر و شعور کی ترسیل عظیم بات ہے- ذیشان صاحب اسلامیات پر جو لکھتے ہیں سو لکھتے ہیں لیکن حالات حاضرہ کے کسی سلگتے دہکتے ابلتے موضوع پر جب دل جمعی کے ساتھ لکھتے ہیں تو کسی قد آور دانش مند سے کسی طور پر کم نہیں لکھتے- حالیہ اداریہ بہ عنوان "بابری مسجد کیس: قانونی بے انصافی کا حل قانونی چارہ جوئی" انہی باتوں کا آئینہ دار ہے- اللہ کریم موصوف کو حصار کرم میں لے لے اور شش جہات سمت مقابل شب و روز ان پر اپنی تائیدی رحمت کے پہرے بٹھا دے- آمین ثم آمین!

حضرت ڈاکٹر سید علیم اشرف صاحب جائسی اور حضرت مولانا اسید الحق صاحب تو ایسے ہیں کہ ہر خانقاہ کو اس طرح کے لوگ نصیب ہو جائیں تو عہد حاضر میں تمام گلے شکوے وغیرہ جہاں دور ہوں گے وہیں خانقاہوں کی عظمت رفتہ بھی بحال ہو جائے گی-

حضرت اسید صاحب نے "تقریروں میں موضوع روایات- ایک لمحۂ فکریہ" سے ہلچل پیدا کر دی ہے- جناب والا کی تحریروں و تصنیفوں سے

ہم بے مایہ افراد کو بہت کچھ سمجھنے سیکھنے کا موقع میسر ہوتا ہے اور نت نئے گوشوں پر آنکھیں وا ہوتی ہیں اور دل بیدار ہوتے ہیں- لیکن یہ تازہ بہ تازہ وگر ما گرم تحریریں کچھ اور ہی اثرات مرتب کر سکتی ہے- تاک میں رہنے والے شورش پسند ملبے میں "یوال وپذر" کا بھی اندیشہ ہے- اللہ خیر کرے!

جامعہ از ہر قاہرہ سے واپسی کے بعد حضرت اسید صاحب نے باقاعدہ طور پر جب سے جام نور کا محاذ سنبھالا ہے اور معلومات و اطلاعات سے بھر پور مواد کا ابلاغ و ترسیل خواص و عوام تک شروع فرمائی ہے خاکسار کو یہ دو تحریریں "کتب اسلاف میں تحریف کی دانستہ کوششیں" اور "تقریروں میں موضوع روایات- ایک لمحہ فکریہ" تادیر یاد رہیں گی ان شاء اللہ تعالیٰ- زیر نظر شمارہ بابت ماہ نومبر ۲۰۱۰ء پڑھ کر یہ تأثرات ارتجالاً قلم بند ہوئے ہیں- اگر کاغذ کی یہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں پسند آجائیں تو شائع کرنے کی غلطی ضرور فرمائیں-

کیا حدیث میں امام غزالی کے حوالے ناقابل قبول ہیں؟

مفتی شمیم القادری
استاذ: مدرسہ دینیہ غوثیہ مظفر پور (بہار)

مخلص گرامی قدر جناب خوشتر نورانی! سلام ورحمت...... جامِ نور کا مطالعہ میرے لیے تسکین کا باعث ہے- جب تک اسے پڑھ نہیں لیتا ہوں سکون غارت رہتا ہے- اس موقر رسالہ کا ہر مضمون نہ صرف قابلِ مطالعہ بلکہ معلومات افزا ہوتا ہے- اور دل کو چھو جانے والے اداریہ میں آپ کا سراپا صاف دکھائی دیتا ہے-

اکتوبر، نومبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں حضرت مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کا مضمون "تقریروں میں موضوع روایات- ایک لمحۂ فکریہ" کے مطالعہ سے مقررین کے درمیان ایک ہیجانی کیفیت طاری ہے- موصوف نے جن حدیثوں کا ذکر اپنے مضمون میں کیا ہے ان میں سے کچھ حدیثیں تو حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمۃ والرضوان کی معروف کتاب احیاء علوم الدین میں بھی حوالہ کے ساتھ موجود ہیں، مثلاً اطلبوا العلم ولو کان بالصین (بحوالہ بیہقی، ابن عدی) احیاء العلوم مترجم مولانا ندیم الواجدی، شائع کردہ دار الکتاب، دیوبند، جلد: ۱، قط: ۱، ص: ۴۰- یوزن حبر العلماء ودم الشهداء فیرجح ثواب حبر العلماء (بحوالہ عبدالبر) جلد: ۱، قط: ۱، ص ۳۳- الشیخ فی قومه کالنبی فی أمته (بحوالہ ابن حبان، دیلمی) جلد: ۱، قط: ۱، ص: ۲۰۴-

ایک حقیر طالب علم کی حیثیت سے میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ کیا امام غزالی کے یہ حوالے ناقابلِ قبول ہیں؟- خط سے منسلک ایک طرحی نعت پاک بھی ہے جام نور کے معیار پر اترے تو اسے شریک اشاعت فرمالیں-

ادارتی نوٹ: جن چند حدیثوں کا آپ نے اپنی اس تحریر میں تذکرہ کیا ہے انہیں امام غزالی نے آپ کے مذکورہ حوالوں کے ساتھ نہیں ذکر کیا ہے بلکہ یہ حافظ عراقی کی تخریجات ہیں جسے شاید آپ نے امام غزالی کی تحریر سمجھ لیا- اس سے قطع نظر اگر امام غزالی یا کسی اور شخصیت نے کسی بھی حدیث کو حوالہ کے ساتھ ذکر بھی کر دیا ہو تو اس پر گفتگو کی گنجائش ختم نہیں ہو جاتی، کیوں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث کی متعدد سندیں ہوتی ہیں اور ان سندوں کے لحاظ سے وہ حدیث صحیح، ضعیف اور موضوع ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں اس حدیث پر گفتگو کی گنجائش باقی رہتی ہے- اور آخر میں یہ بات ہم سب کے لیے ذہن نشیں کرنے کی ہے کہ امام غزالی یا کسی بھی عبقری کی کتاب میں دو ایک حدیث ضعیف یا موضوع شامل بھی ہو تو اس سے ان کی عبقریت متاثر نہیں ہوتی-

جام نور میں سلف صالحین کا پیغام ہی شائع ہوتا ہے

شمیم احمد ابن محمد اکر
زورہ، شوپیان (کشمیر

مولانا جناب خوشتر نورانی صاحب! سلام ورحمت...... عرض یوں ہے کہ رسالہ جام نور مجھے برابر ملتا رہا اور مل بھی رہا ہے حالاں کہ مدت فیر کب کی ختم ہو چکی ہے- اس کے باوجود بھی رسالہ پہنچنے کا سلسلہ جاری رہا- اس کے شکریہ کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں- البتہ اپنی زبان گندہ اور

دل پراگندہ سے رب عزوجل کی بارگاہ میں عرض گزار ہوں کہ وہ اس ادارہ کو تا قیامِ قیامت قائم ودائم رکھے اور اس کے بے لاگ عمل کو جاری وساری رکھے اور اس میں کام کرنے والے علمائے کرام کو زیادہ سے زیادہ دین اسلام کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بالتخصیص آپ یعنی خوشتر نورانی صاحب کو، جن کا اداریہ پڑھنے سے بہت ساری راہیں ہموار ہوتی ہیں، جب کہ دوسرے علمائے عظام کے مضامین بھی قابلِ ستائش اور قابل تحسین ہوتے ہیں۔ بہر حال میں ان تمام علمائے کرام کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جو اہلِ سنت وجماعت کو فروغ دینے میں مصروف وسرگرداں ہیں اور جو خدا ورسول ﷺ کا پاک فرمان اور سلف صالحین اولیائے کاملین علیہم الرحمۃ والرضوان کا کلام عالی شان اس دور میں ہم تک پہنچانے کی سعی بلیغ فرماتے ہیں۔ مگر جب علمائے اہلِ سنت وجماعت کے مضامین جامِ نور کے ذریعہ ہم تک پہنچ جاتے ہیں تو ہمارے مضمحل قلوب پھولے نہیں سماتے۔ اس لیے کہ ان مضامین میں وہی محبت بھرا پیغام ہوتا ہے، وہی راہیں ہموار ہوتی ہیں، وہی اعتقاد اور نور جھلکتا ہے جس کو اولیائے عظام وسلف صالحین علیہم الرحمہ لے کر آئے تھے۔ اس کے علاوہ جام نور میں عصر حاضر کے موافق بھی تحریریں ملتی ہیں جن کے سبب زمانہ کے نشیب وفراز جاننے میں کافی مدد ملتی ہے، جس کے لیے جامِ نور مزید ستائش کا سزاوار ہے۔

بہر حال ہماری دعا ہے کہ جو بھی عالم دین اسلام کے لیے اپنی زندگی صرف کرتا ہے اور حضور رحمۃ للعلمین کا عشق لوگوں کے دلوں میں پیوست کرنے کے لیے کوشاں ہے، اللہ کرے ان کو حضور ﷺ کے صدقے اس عمل کا صلہ رب عزوجل اور اس کے حبیب ﷺ کے راضی ہونے کی صورت میں ملے۔ آمین

کسی ایک محدث کے فیصلے سے حدیث بالاتفاق موضوع نہیں ہوتی

فہیم احمد ثقلینی
استاذ: دار العلوم فیضان شاہ ثقلین، قصبہ گمرالہ، بدایوں (یوپی)

محترم مولانا خوشتر نورانی صاحب! اسلام مسنون...... رئیس القلم نمبر سے تادم تحریر جام نور کا مستقل قاری ہوں۔ مختلف مکاتیب فکر کے علاوہ اہل سنت وجماعت کے کم وبیش ایک درجن رسائل وجرائد اور مجلات کا قاری ہوں مگر ان تمام رسائل میں جامِ نور ہی ایسا منفرد رسالہ ہے جس کا مطالعہ ہمیشہ ایک ہی نشست میں کرتا ہوں۔ اکتوبر و نومبر کے شمارہ میں اہلِ سنت وجماعت کے مشہور ومعروف اسکالر اور خانوادۂ عثمانیہ بدایوں کے چشم وچراغ مولانا اسید الحق محمد عاصم القادری کا ایک معلوماتی مضمون ''تقریروں میں موضوع روایات۔ لمحۂ فکریہ'' باصرہ نواز ہوا۔ پہلی قسط کی اشاعت کے بعد چند احباب نے بذریعہ فون رابطہ کیا۔ خیر سے جن کا تعلق کمرشیل خطبا سے ہے ان کا کہنا ہے کہ اب نئی تقریریں تیار کرنا ہوں گی اور اسٹیج پر احتیاط سے لب کشائی کرنا ہوگی۔ اصول حدیث، قواعد جرح وتعدیل کی روشنی میں جو احادیث متفق علیہ ''موضوع'' ہیں ان کی نشان دہی سے خطبا چراغ پا ہیں۔ دسمبر کے مہینہ میں اظہار خیالات کا کالم تقریبا مولانا اسید الحق صاحب کی نذر ہو گیا ہے، جناب سفیان احمد اعوان پاکستان، سید سیف الدین اصدق نالندہ، بہار، محمد اسرائیل رضوی تمل ناڈو اور محمد اشفاق احمد دلشاد پوری کیرالا نے اپنی اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ان لوگوں کی تشویش یہ ہے کہ اب سلفی حضرات ہمیں مطعون کریں گے کہ سنیوں کے سارے معاملات ضعیف اور موضوع حدیثوں پر منحصر ہیں تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اگر اصول حدیث اور قواعد جرح وتعدیل کی روشنی میں کوئی حدیث درحقیقت ضعیف یا موضوع تھی اور اس کی حقیقت واضح کر دی تو اس میں مولانا بدایونی نے کس جرم کا ارتکاب کر دیا؟ ثانیا یہ کہ وہابیہ دیابنہ ہمیں طعن وتشنیع کریں گے تو کیا ان کے خوف سے ہم حق بات کہنا ترک کر دیں اور کیا موضوع احادیث کے ذریعہ برسر منبر شعلہ بیانی کی اجازت دے دی جائے گی؟؟ رہا یہ مسئلہ کہ ہمارے علما کے پاس علوم حدیث کی لیاقت کتنی ہے تو صرف اتنا عرض ہے کہ جب آل انڈیا کانفرنسیں ہوتی ہیں جہاں علما وفضلا اور فقہا ومدرسین کا ایک جم غفیر ہوتا ہے اور کہنہ مشق خطیب حدیث صحیح کہہ کر یہ روایت پیش کرتا ہے جو حارث بن کلدہ طبیب عرب کا قول ہے ''المعدۃ بیت الداء والحمیۃ راس الدواء'' (المقاصد الحسنہ للسخاوی ص ۴۴۷) تو یہ لوگ اچھل اچھل کر داد دیتے ہیں اور صدر جلسہ بھی اسی میں شامل ہوتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر علوم حدیث میں گہری نظر ہوتی تو ایسا ہوتا؟ یہ ایک نمونہ ہے، ورنہ برسر منبر احادیث موضوعہ بڑے طمطراق سے پیش کی جارہی ہیں ——— بقیہ صفحہ ۶۲ پر ملاحظہ کریں

مسائل اور الجھنیں

قارئین جام نور اس کالم میں دینی، علمی، فکری، ادبی، تعلیمی، سائنسی، سیاسی اور سماجی مسائل سے متعلق اپنے سوالات/الجھنوں کا جواب/حل حاصل کر سکتے ہیں- اس کے لیے قارئین اپنے سوالات مختصر لفظوں میں لکھ کر ادارے کے پتے پر ارسال کریں- (ادارہ)

علما کے کس گروہ کا اتباع کریں؟

سوال:- علما میں مسلکی اختلافات کے ساتھ علمی طور پر بھی ان کے مختلف گروہ ہیں، محدثین کی الگ جماعت ہے، فقہا کی جماعت الگ ہے اور متکلمین و صوفیہ کی جماعت الگ ہے- بعض احباب کا ماننا ہے کہ صرف محدثین اور علماے حدیث ہی حق پر ہیں، بعض حضرات امام غزالی کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ صرف صوفیہ کی جماعت ہی اہل حق کی جماعت ہے، جب کہ اہل علم کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو صوفیہ کے ملفوظات اور کتابوں کی ثقاہت پر انگشت نمائی کرتا ہے- ایسے میں ہم علما کی کس جماعت کی پیروی کریں، براہ کرم ہماری رہنمائی کریں-

خورشید عالم، درگاہ روڈ، گلبرگہ (کرناٹک)

جواب: مرشد اعظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ آپ انسان کامل ہیں- آپ کی حیات طیبہ دین و دنیا کی امامت و ہدایت کا مکمل سرچشمہ ہے- آپ کے بعد ''علم دین'' کی تین شاخوں الاسلام، الایمان اور الاحسان کو تین گروہ علما لے کر آگے بڑھے، کیوں کہ بالخصوص عہد صحابہ کے بعد ایسی جامع صفات شخصیتیں کم ہوئی ہیں جو تمام دینی و علمی اوصاف و کمالات کی جامع ہوں- ایسے میں اسلام کے ظاہری احکام و معاملات کی تحقیق و تشریح کا کام فقہا نے کیا- ایمان کی تحقیق و تشریح کا کام متکلمین نے کیا جب کہ احسان و سلوک اور تزکیۂ نفوس کا عظیم ترین فریضہ صوفیۂ کرام نے انجام دیا- اسلام کی اساس اول یعنی کتاب اللہ چوں کہ ہر تغیر و تبدل اور تحریف سے پاک رہی البتہ اساس ثانی یعنی احادیث رسول کی روایت و اسناد میں مختلف غیر صالح مقاصد کے تحت الحاق و تلبیس کا کام بڑے پیمانے پر رہا- اس لیے اب علماے اسلام کا ایک گروہ ایسا بھی سامنے آیا جس نے صحیح حدیثوں کو الحاقی اور موضوع حدیثوں سے چھانٹ کر الگ کر دیا- ایسے میں حدیث کی ایک تیسری قسم یعنی حدیث ضعیف بھی سامنے آئی جس کی نہ صحت قطعی تھی اور نہ موضوعیت- محدثین نے اس الجھن کو اس طور سے رفع کیا کہ ایسی حدیثوں کو احکام حلال و حرام کے اثبات کے لیے غیر معتبر قرار دیا کیوں کہ یہ حدیثیں معیار صحت پر پوری نہیں اتر رہی تھیں اور فضائل و مناقب میں ان حدیثوں کو معتبر مانا کیوں کہ ان کا حدیث نہ ہونا قطعی نہیں تھا، لہٰذا ان کا اقل ترین مقام یہ تھا کہ انہیں کم از کم فضائل میں معتبر مانا جائے- علماے اسلام کے یہ چاروں گروہ تاریخ اسلام میں موجود رہے ہیں، لیکن علما کی اس درجہ بندی (Catagerization) سے یہ سمجھنا کہ جو فقہا تھے وہ متکلم، صوفی، محدث نہیں تھے، جو متکلم تھے وہ فقیہ، صوفی اور محدث نہیں تھے، جو صوفی تھے وہ فقیہ، متکلم اور محدث نہیں تھے یا جو محدث تھے وہ فقیہ، متکلم اور صوفی نہیں تھے، سخت نادانی اور غلط فہمی ہے- یہ تمام نفوس قدسیہ بیک وقت چاروں میدان کے شہسوار تھے البتہ اختصاص اور Specialization جن کا جس شعبے میں تھا، طبعی میلان جن کا جس میدان کی طرف زیادہ تھا، وہ اسی میدان کے حوالے سے زیادہ مشہور ہوئے اور اکثر یہ ہوا کہ ایک میدان کار کے عالم نے اسی میدان میں زیادہ خدمات انجام دیں- کسی دوسرے میدان علم کی طرف اس کی توجہ کم رہی- متکلمین کی پوری توجہ عقیدے کی اصلاح پر، فقہا کی مسائل کی تخریج پر، محدثین کی حدیث کی صحت و سقم پر اور صوفیہ کی اصلاح وارشاد پر مرکوز رہی-

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ علماے اسلام کے ان چاروں طبقات کا یکساں احترام کیا جائے اور جس عالم کا جو میدان اختصاص ہے اس عالم سے اس میدان کے حوالے سے بھرپور استفادہ کیا جائے- کسی ایک گروہ علما کی طرف مائل ہو جانا اور دوسرے سے

منحرف یا متنفر ہو جانا سخت احمقانہ عمل اور باعث گمراہی ہے- اسی طرح فقیہ سے عقیدہ، متکلم سے احسان وسلوک، صوفی سے حدیث اور محدث سے فقہ حاصل کرنے کی بات بھی خالص غیر دانش مندانہ ہے- جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ سخت الجھاؤ کا شکار ہو جاتے ہیں- ایسے لوگوں کے لیے ہی عربی کا مقولہ ہے کہ اعط القوس باریھا "کمان ماہر کمان گر کو دو" ایسے حضرات کو یہ بات بھی سمجھنی چاہیے کہ لکل عمل رجال "ہر کام کے لیے خاص مردان کار ہوتے ہیں" واضح رہے کہ میری یہ گفتگو ان علمائے فحول سے متعلق نہیں ہے جن کے میدان اختصاص بیک وقت ایک سے زائد رہے ہیں-

احادیث میں صوفیہ کا مذاق ومنہج کیا ہے؟

سوال:- احادیث رسول صلی الله علیه وسلم کے سلسلے میں صوفیه کا مذاق و منہج کیا ھے؟ بعض حضرات کھتے ھیں که صوفیه اسناد کے علاوہ کشف وغیرہ کو معیار تحقیق سمجھتے ھیں، سوال یه ھے که اگر کشف کو معیار بنالیا جائے تو پھر تو حدیث کے اصولوں کا خدا ھی حافظ ھوگا- اس سلسلے میں صحیح موقف کیا ھے، صوفیه کے کشف کو معیار بنایا جائے یا اسے مسترد کردیا جائے؟ صوفیه کا کشف مطلقاً دلیل وحجت ھے یا اس کی کچھ شرائط ھیں یا وہ بالکل ھی ناقابل اعتبار ھے؟ جواب سے نوازیں-

عابد حسین رضوی، ہوڑہ (کولکاتا)

جواب: حواس خمسہ کے سوا حاسۂ سادس جو وحی والہام کا مہبط ہے، پر جن لوگوں کا ایمان ویقین ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ حاسہ زمانۂ رسالت کے بعد کند نہیں ہو گیا- ختم نبوت محمدی کے بعد صرف یہ ہوا کہ وحی کا تسلسل رک گیا البتہ الہام ومنام کا سلسلہ جاری رہا جسے ایک حدیث میں نبوت کا ۴۶واں حصہ قرار دیا گیا ہے- (بخاری، کتاب التعبیر، باب الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ واربعین جزأ من النبوۃ) یہ حصہ بعد کے ادوار میں صالحین ومتقین اور اولیائے کاملین کو تسلسل کے ساتھ ملتا رہا ہے- جو لوگ اس تسلسل کی نفی کرتے ہیں در اصل ان کی مثال اس مرد ناکارہ کی ہے جو لذت جنس سے محروم ہے اور وہ اس کا انکار کرتا ہے، ورنہ علمی طور پر ایسے لوگوں کے پاس کتاب وسنت اور اجماع بلکہ عقل وقیاس سے بھی کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جس سے الہام ومنام کے تسلسل کی نفی ہو سکے- اور جب الہام ومنام اور کشف کی حقیقت حدیث رسول سے ثابت ہے تو پھر یہ ماننے میں بھی کوئی قیامت نہیں آجاتی کہ کسی حدیث کی صحت وضعف کے بارے میں کسی عبد صالح کو من جانب اللہ الہام ہو یا بذریعہ کشف اللہ کریم جل مجدہ اسے کسی حدیث کی صحت وضعف سے واقف کرادے- البتہ علمائے عقاید نے جب کشف کا دائرہ کار متعین کیا ہے تو یہ کہا ہے کہ کشف صاحب کشف کے لیے دلیل ہے، دوسروں کے لیے نہیں اور ایسا اس لیے تاکہ ہر بوالہوس حسن پرستی شعار نہ کرنے لگے- اس کو مطلقاً حجت مان لیا جاتا تو ہر دوسرا شخص اپنے توہمات وخرافات کو ثابت کرنے کے لیے درجنوں جھوٹے کشف کا انبار لگا دیتا اور اس طرح شریعت بازیچۂ اطفال بن جاتی- علامہ تفتازانی شرح العقائد النسفیہ میں لکھتے ہیں: "علامہ نسفی کی عبارت سے ظاہر یہ ہے کہ الہام عامۃ الناس کے لیے حصول علم کا سبب نہیں ہے، نہ دوسروں کے خلاف دلیل بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات الہام کے ذریعے بھی علم کا حصول ہوتا ہے-"

(شرح العقائد، ص: ۴۳، مجلس البرکات، مبارک پور، ۲۰۰۲ء)

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جہاں ایک طرف حدیث کے سلسلے میں کسی عارف کامل کی رائے کو مطعون نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ عارف کی وہ رائے اس کے کشف کی بنیاد پر ہو اور علمی وشرعی طور پر اس کا کشف اس کے لیے دلیل وبرہان کا درجہ رکھتا ہے تو دوسری طرف جب عام حالات میں نقد حدیث کی بات آئے تو حدیث کی پرکھ کے سلسلے میں محدثین کا جو معیار ومنہاج ہے اس کے مقابل کسی صوفی کا قول پیش کرنا بھی علمی نقطۂ نظر سے غلط ہوگا- جس کا جو مقام ہے وہ مقام اسے دیا جانا چاہیے اور جس فن کے جو حدود اور تقاضے ہیں انہیں ملحوظ رکھا جانا چاہیے- سخن فہمی لازم ہے، بے سبب غالب کی طرف داری اچھی نہیں- □□□

مدیر اعلیٰ جام نور اور مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کا سفر پاکستان اور علمائے پاکستان کے انٹرویوز اگلے شمارے سے ملاحظہ کریں- (ادارہ)

تصوف کی اسکالراور شعبۂ تاریخ دہلی یونیورسٹی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر

محترمہ ڈاکٹر میناکشی کھنہ سے ملاقات

محترمہ میناکشی کھنہ متواضع، تصوف دوست، اردو پسند، بااخلاق اور منکسر المزاج شخصیت کی مالک ایک آزاد اور حقیقت پسند اسکالر ہیں۔ پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت دہلی کی اردوے معلی کے ماحول میں ہوئی۔ تقسیم کے الم ناک حادثے نے آپ کے مورثین کو لاہور کے اطراف سے کشمیر کے راستے دہلی ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ آپ نے سینٹ اسٹیفن کالج دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۹۰ء میں گریجویشن کیا۔ وہیں سے ۱۹۹۲ء میں ہندوستان کی عہدوسطی کی تاریخ سے ایم اے کیا، پھر اسی عہد کے حوالے سے ''کشف، منام اور کرامت: صوفیانہ تجربات کے چند پہلو'' پر جواہرلال نہرو یونیورسٹی دہلی سے ۱۹۹۵ء میں ایم فل کیا اور وہیں سے ۲۰۰۲ء میں ''خواب اور الہام: شمالی ہند کی صوفیانہ روایت میں (۱۵۰۰ء-۱۸۰۰ء)'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ہندی، انگلش، اردو، فارسی اور پنجابی زبانوں سے واقف ہیں۔ اندراپرستھا کالج فار ویمن دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ۱۹۹۵ء سے تدریسی فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ جواہرلال نہرو یونیورسٹی دہلی اور یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا امریکا اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی مہمان استاذ کی حیثیت سے پڑھا چکی ہیں۔ متعدد درسی اور علمی کتابوں کی مصنف، شریک مصنف، مترجم اور مدون ہیں۔ درجن بھر سے زائد ملکی اور بین الاقوامی سمیناروں میں اپنے مقالے پڑھے ہیں اور مختلف یونیورسٹیوں میں تاریخ وتصوف کے حوالے سے توسیعی خطبات دیے ہیں۔ تصوف کے مختلف پہلوؤں پر لیا گیا انٹرویو امید ہے کہ قارئین کو ضرور پسند آئے گا

خوشتر نورانی

جام نور: ۔تصوف کے مطالعے کا شوق کب اور کیسے ہوا؟

ڈاکٹر میناکشی کھنہ: ۔کسی بھی چیز کے شوق کی حصولیابی میں خاندانی پس منظر یا فیملی بیک گراؤنڈ کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ مجھے بھی تصوف کے مطالعے اور اس پر کام کرنے کا شوق اپنے گھریلو ماحول سے ہوا، چونکہ میرے آباء واجداد پرانے پنجاب کے تھے جو اب لاہور پاکستان کا حصہ ہے، میرے والد کی پرورش کشمیر میں ہوئی، پھر تقسیم کے بعد ہم دہلی آگئے، میری پیدائش دہلی میں ہی ہوئی۔ اس دور میں اردو اور فارسی ہی اظہار اور علم وفن کی زبان تھی، اس لیے ہمارے گھرانے میں بھی یہی زبان رائج تھی، ہمارے والدین اور دادا بزرگوار بڑی فصیح اردو بولتے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ہمیں کسی بات کے لیے سرزنش کی جاتی تو ان کی زبان کی فصاحت اور بھی بڑھ جاتی (ہنستے ہوئے)۔ اردو اور فارسی کی وجہ سے جو گھریلو تہذیب تھی، وہ مشرقیت کا نمونہ تھی۔ گھر میں شروع سے ہی شعر وسخن اور اردو ادب کا ماحول تھا، بچپن سے ہی ہمیں ٹیلی ویژن پر مشاعرے اور قوالیاں دیکھنے اور سننے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ پھر جب میں نے اسکول کی تعلیم مکمل کر کے تاریخ میں گریجویشن کرنے کے لیے سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخلہ لیا تو میری خوش بختی تھی کہ میرے اساتذہ میں ایک استاد تصوف پر کام کر رہے تھے، حالانکہ ان کا تعلق جنوب ہند سے تھا، پھر بھی ان کا تلفظ اور انداز تحریر بہت عمدہ تھا، وہ بے حد خوشخط تھے۔ ان کی صحبت میں مجھ میں بھی یہ شوق پیدا ہوا کہ میں جانوں کہ انہوں نے اس معیار کی زبان کیسے سیکھی، خود میری دادی محترمہ اردو زبان کی بہت اچھی واقف کار تھیں، انہوں نے ہی مجھے اردو لکھنے اور پڑھنے کی مشق کرائی تھی۔ ان تمام حالات نے مجھے تصوف کی طرف مائل کیا، تصوف کو براہ راست اس کے مأخذ سے پڑھنے کا شوق ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اردو کے ساتھ فارسی زبان بھی آنی چاہیے، اس طرح میں نے پوسٹ گریجویشن کے دوران ہی فارسی زبان میں ایک سال کا ڈپلوما کیا اور پھر تصوف کا مطالعہ شروع کیا۔ تصوف پر سب سے پہلی کتاب میں نے پروفیسر اینمری شمل (Annemarie Schimmel) کی Mystical Dimension of Islam اور حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کی ''کشف المحجوب'' پڑھی۔ یہ دونوں ہی کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ان کے بعد میں نے تصوف کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا، یہاں تک کہ اس موضوع سے میں بہت قریب ہوگئی اور پھر جب میں نے جے این یو میں ایم فل میں داخلہ لیا تو تصوف کو ہی اپنے ریسرچ کا موضوع بنایا، پھر پی ایچ ڈی بھی اسی موضوع پر کیا۔